راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کا 22واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مئی 2021ء

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

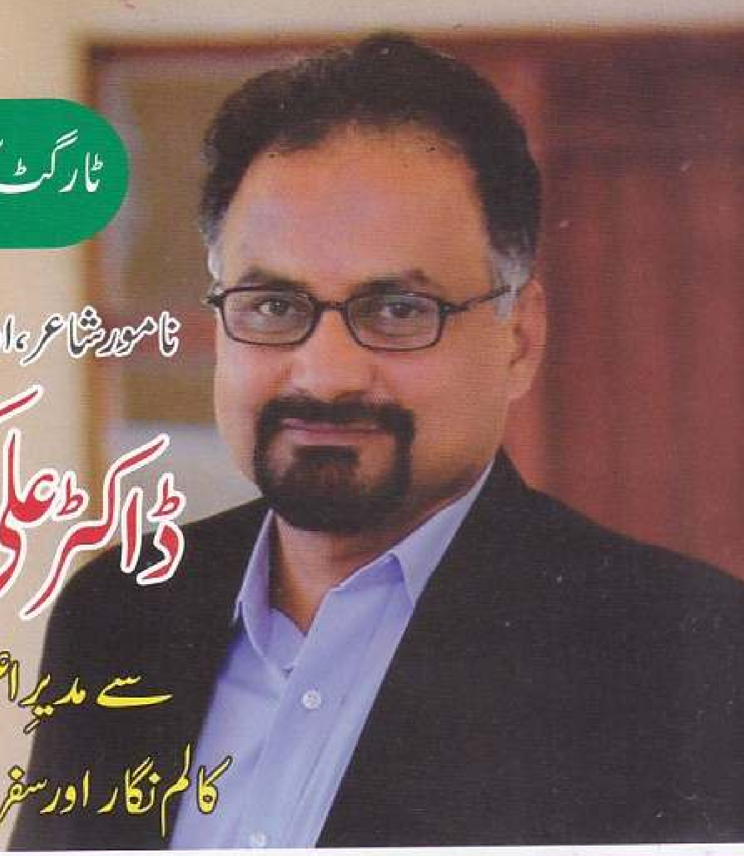

ٹارگٹ کلنگ سے بچنے کے لئے کوئٹہ سے جبری ہجرت کرنا پڑی

نامور شاعر، ادیب، محقق، منفرد مترجم، ماہر لسانیات اور معروف ماہر تعلیم

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفر نامہ نگار عامر بن علی کا مکالمہ

تہران یونیورسٹی کے اساتذہ سے میں نے پڑھانا سیکھا۔ تخلیقیت ایک خدائی صفت ہے۔ ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو بطور شاعر ادیب، محقق و مترجم تو ایک زمانہ جانتا ہے، درسگاہوں سے متعلق افراد انہیں ماہرِ تعلیم اور فارسی دانی کے حوالے سے بھی خوب پہنچانتے اور معترف ہیں۔ قارئین ارژنگ کو مگر میں ان کا تعارف ایک ایسے سکالر اور عالم کے طور پر کروانا چاہتا ہوں ادب کے شعبے میں جن کے ہم پلہ نقطہ دان وطن عزیز میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ایک ایسے شفیق استاد جو تدریس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ میری خوش بختی ہے کہ میں نے ایک سال ان سے فارسی زبان و ادب پڑھا اور قارئین ارژنگ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے مکالمے کے لئے ہمیں وقت دیا۔ ڈاکٹر علی کمیل قزلباش جیسے ہمہ جہت تخلیق کار اور دانشور پاکستان کی شان ہیں اور ادب کی آبرو ہیں۔

ارژنگ: گفتگو کا آغاز آپ کی ابتدائی زندگی سے کرتے ہیں۔ کہاں پیدا ہوئے؟ اور بچپن کہاں گزرا؟ اپنے سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے۔

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میری پیدائش بلوچستان کے علاقے لورالائی کی ہے۔ پرورش اور ابتدائی تعلیم بھی لورالائی میں ہی مکمل ہوئی۔ میرے والد محنت کش تھے۔ ایف سی ملیشیا میں سپاہی بھرتی ہوئے اور اس سے پیشتر وہ مزارع تھے۔ پہلے پہل ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ مگر جب والد صاحب نے ایف سی میں نوکری شروع کر دی تو ہم شہر میں آگئے۔ تعلیم کا آغاز سرکاری سکول میں کیا جسے عرف عام میں ٹاٹ والا سکول کہتے ہیں۔ میٹرک کے بعد میں نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ مگر امتحان کے دوران ایک طلبہ تنظیم نے ہنگامہ آرائی کی اور بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ حکومت نے تین سال کے لئے ہمارے شہر سے امتحانی مرکز ہی ختم کر دیا۔ نتیجتاً مجھے پرائیویٹ ایف اے کرنا پڑا۔ اس کے بعد بی اے بھی پھر پرائیویٹ ہی کیا۔ سکول میں میرا ایک کلاس فیلو جوتوں کا کام کرتا تھا۔ مجھے اس نے دوست ہونے کے ناطے اس کام میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے جوتے بنانے سیکھے اور کافی عرصہ جوتے بناتا رہا۔ ایف ایس سی میں مجھے محسوس ہوا کہ پڑھائی اور جوتے بنانے کا کام اب ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نے ادبیات کی محبت میں پاپوش سازی چھوڑ دی۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: تخلیقیت اصل میں ایک خدائی صفت ہے۔ مجھے عرض کرنے دیجئے کہ

این سعادت بزور بازو نیست

میری نظر میں تخلیقیت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے انکشاف کے ذریعے کائنات کے انکشاف کی طرف بڑھتا ہے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات پر)

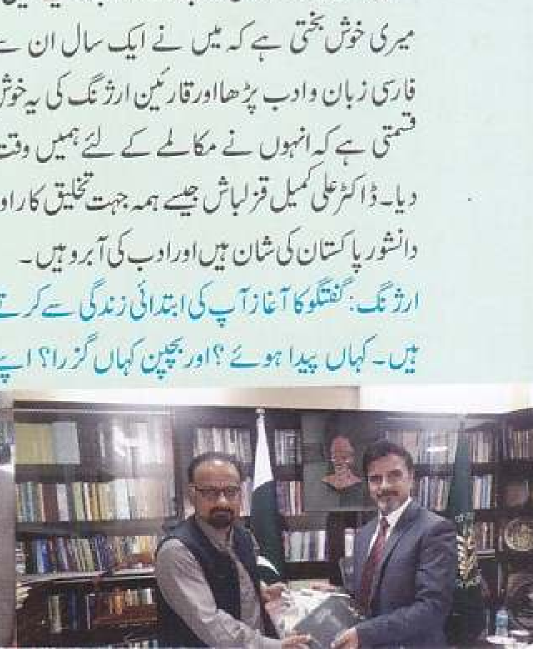

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 22 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 22　　مئی 2021　　شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس ادارت}

جعفر حسن مبارک ◉ ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم

{مجلس مشاورت}

◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ● نعمان حسن: 0333-4918383

سرورق: ڈاکٹر فوزیہ فاروق آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاو کارڈی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ، 2
نعتیہ قصیدہ محسنِ انسانیت / شاعر علی شاعر ، 5
مضامین:
○ جمال الدین پانی پتی / ڈاکٹر علی محمد خاں ، 8
○ احمد فراز / جمیل یوسف ، 11
○ شفیق سلیمی کی غزل / جلیل عالی ، 16
○ میں اور مجلس ترقی ادب /منصور آفاق ، 18
○ میزانِ فکر / نسیم سحر ، 19
○ زرداغ کا شاعر۔ ولی عالم شاہین /سعدیہ سیٹھی ،21
○ صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی / حسین احمد رحمانی ،22
○ علم کی حقیقت / علی لاشاری ،24
شعری گوشے:
○ مظہر نیازی، انور ندیم علوی، عقیل شاہ، احسان گھمن
سیّد شہباز گردیزی 25 تا 29
افسانے
○ گلی نمبر 10 / امین کنجاہی ، 30
○ غلام زادے / پروفیسر نور کمال شاہ ، 32
○ خوش نصیب / سنیعہ مرزا ، 35
○ شناسائی / مریم طاہرہ ، 37
○ سرگوشیاں /عادل سعید قریشی ، 40
○ دانا اور جال / حافظہ زینب خالد ، 45
شاعری: 47 تا 49
طنز و مزاح: میری سادگی دیکھ / گل نوخیز اختر ، 50
کالم: ○ خالد علیم کا شعری سفر / نوید مرزا ، 51
○ سائیں، صاحب / عامر بن علی ، 52
○ ارشاد نامہ / لبنیٰ صفدر ، 53
○ شاعری 54
○ انٹرویو: علی کمیل قزلباش ، 55
○ انٹرویو: حماد نیازی ، 59
ادبی خبریں ، 61
نامہ ہائے احباب ، 63

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

ہر ایک لمحے کے اندر قیام تیرا ہے
زمانہ ہم جسے کہتے ہیں نام تیرا ہے
ورائے اوّل و آخر ہے تو مرے مولا
نہ ابتداء نہ کوئی اختتام تیرا ہے
تری ثنا میں ہے مصروف بے زبانی بھی
سکوتِ وقت کے لب پر کلام تیرا ہے
شعور نے سفرِ لاشعور کر دیکھا
تمام لفظ ہیں اُس کے دوام تیرا ہے
تمام عمر کٹے اک طویل سجدے میں
اس اختصار کی بخشش بھی کام تیرا ہے
بہت قریب ہے فطرت سے روحِ انسانی
ہر اک نظام سے بڑھ کر نظام تیرا ہے
وہ خود کو جان گیا جس نے تجھ کو پہچانا
وہ محترم ہے جسے احترام تیرا ہے
ہر ایک سانس سے آواز آ رہی ہے تری
مرا دھڑکتا ہوا دل، پیام تیرا ہے
کہاں بیانِ مظفر کہاں بڑائی تیری
جو تھا جو اَب ہے جو ہوگا تمام تیرا ہے

مظفر وارثی

تابِ سخن کہاں ہے مجالِ سخن کہاں
توصیف اُس کی کر سکوں حاصل وہ فن کہاں
تیرے ہی ذکر سے مرا روشن ضمیر ہے
تیرے بغیر زیست مری ضوفگن کہاں
بے شک ہے تو بہار بھی جانِ بہار بھی
موجود تو نہ ہو تو یہ حُسنِ چمن کہاں
جو منفرد کرے مجھے اس کائنات میں
مجھ میں وہ تیرے عشق کا دیوانہ پن کہاں
کیسے ادا ہو تیری عنایت کا شکریہ
ایسی زباں کہاں مری ایسا سخن کہاں
میرا وجود عجز ہے تیرا وجود ناز
تیری رضا بغیر زمین و زمن کہاں
تو جس کو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے کام یاب
ہر ایک دل میں نور ترا ضوفگن کہاں
ہم کو ملا ندیم، ہے سایہ کریم کا
اُس کی ثنا میں کر سکوں ایسا سخن کہاں

ریاض ندیم نیازی/سبی

جن رنگوں میں دیکھی دُنیا صاحب کی
اُن رنگوں میں کی ہے پوجا صاحب کی
سورج چاند ستارے اپنے ساتھ لیے
روز گزر جاتی ہے گھیا صاحب کی
اُس کے ہار سنگھار میں ہوں مصروف بہت
میرے گھر آئی ہے گڑیا صاحب کی
جب میں شب کو اُس میں دیپ بہاتا ہوں
سندر ہو جاتی ہے ندیا صاحب کی
بیٹھے بیٹھے میں مجرم بن جاتا ہوں
پنکھے سے ٹکرائے چڑیا صاحب کی
میں تو اُس کو چھونے سے بھی ڈرتا ہوں
چیز ہوا کرتی ہے بڑھیا صاحب کی
اُس کا نشہ ہرگز ٹوٹ نہیں سکتا
جس نے گھول کے پی لی پڑیا صاحب کی
آپ دریچہ کھول کے میرے کمرے کا
مجھ سے ملنے آئی پروا صاحب کی

حسن عباسی/لاہور

کارِ پردازِ جہاں جلوہ ترا
بے خودی کا اک سماں جلوہ ترا
اہتزازِ کیفِ جاں جلوہ ترا
عفتِ مریم نشاں جلوہ ترا
ذوق و شوقِ عاشقاں جلوہ ترا
حرفِ حق، صوتِ اذاں جلوہ ترا
تیر ہے، نوکِ سناں جلوہ ترا
ہمتِ خیبر نشاں جلوہ ترا
محرمِ رازِ نہاں جلوہ ترا
ماورائے ایں و آں جلوہ ترا
برف دم آتش بجاں جلوہ ترا
ایک وعدہ ایک ہاں جلوہ ترا
پیار کی ہمراہیاں جلوہ ترا
صورتِ تکمیلِ جاں جلوہ ترا
دل وہی کا آستاں جلوہ ترا
جلوۂ حُسنِ بُتاں جلوہ ترا
راہ و رسمِ جانِ جاں جلوہ ترا
قیس کا عزمِ جواں جلوہ ترا
لہجۂ شیریں دہاں جلوہ ترا
ایک لفظِ کن فکاں جلوہ ترا
ہر بیانِ نکتہ داں جلوہ ترا
ہر وجودِ لامکاں جلوہ ترا
از زمیں تا آسماں جلوہ ترا
آسماں در آسماں جلوہ ترا
وقت سے آگے رواں جلوہ ترا
رہ نوردِ کوئے جاں جلوہ ترا
عرشِ خلّاقِ جہاں جلوہ ترا
آبشارِ نغمہ خواں جلوہ ترا

ماہ، انجم، کہکشاں جلوہ ترا
گلستانِ بے خزاں جلوہ ترا
اہتمامِ باغباں جلوہ ترا
نکہتوں کا اک جہاں جلوہ ترا
نسخۂ تطہیرِ جاں جلوہ ترا
اک سکونِ حفظِ جاں جلوہ ترا
انبساطِ جسم و جاں جلوہ ترا
تندیٔ خوئے رواں جلوہ ترا
حُسن کی خود بینیاں جلوہ ترا
کس قدر آتش فشاں جلوہ ترا
سائباں در سائباں جلوہ ترا
شعلۂ قلبِ تپاں جلوہ ترا
سُر کی خوش اسلوبیاں جلوہ ترا
نغمۂ شکر فشاں جلوہ ترا
رنگ کی تابانیاں جلوہ ترا
مستیاں، سرشاریاں جلوہ ترا
علتِ تقویمِ جاں جلوہ ترا
سجدہ گاہِ شاعراں جلوہ ترا
جسم میں روحِ رواں جلوہ ترا
روح میں ہے ضوفشاں جلوہ ترا
نثر کی گل کاریاں جلوہ ترا
شاعری کی ہر زباں جلوہ ترا
چاندنی کا سائباں جلوہ ترا
نغمۂ ریگِ رواں جلوہ ترا
مرہمِ زخمِ دلاں جلوہ ترا
رعد ہے شیر ژیاں جلوہ ترا
ماہ پاروں کا سماں جلوہ ترا
غمزہ و نازِ بتاں جلوہ ترا
عشق کا بحرِ رواں جلوہ ترا
اور حُسنِ بے کراں جلوہ ترا

ہر ہدایت ناقصاں جلوہ ترا
رہنمائے کاملاں جلوہ ترا
آگہی کا ارمغاں جلوہ ترا
خشتِ بنیادِ جہاں جلوہ ترا
شب میں ہے کیا ضوفشاں جلوہ ترا
مظہرِ نورِ جہاں جلوہ ترا
ارتقائے خاکیاں جلوہ ترا
عزم کا کوہِ گراں جلوہ ترا
حسرتوں کا خاک داں جلوہ ترا
غم کی میٹھی چُٹکیاں جلوہ ترا
کشتیٔ عمرِ رواں جلوہ ترا
اک سکونِ قلب و جاں جلوہ ترا
اک ہے معراجِ زماں جلوہ ترا
اک خراجِ شہہ جہاں جلوہ ترا
ہر ورودِ گُل رُخاں جلوہ ترا
رُوپ کی گل کاریاں جلوہ ترا
نکہتوں کا ارمغاں جلوہ ترا
نصرتوں کا نردباں جلوہ ترا
سر بسر دارالاماں جلوہ ترا
مایۂ بے مائیگاں جلوہ ترا
بے خُودی کا ترجماں جلوہ ترا
اک کھلا رازِ نہاں جلوہ ترا
زندگی کی شوخیاں جلوہ ترا
ہر قدم پر مہرباں جلوہ ترا
ہر محبت کی زباں جلوہ ترا
لفظوں کی شرح و بیاں جلوہ ترا
علم کی گہرائیاں جلوہ ترا
معجزے، پُرکاریاں جلوہ ترا
حرف کی رعنائیاں جلوہ ترا
سربسر زیبائیاں جلوہ ترا

ردِّ تشکیک و گماں جلوہ ترا
مایۂ اسلامیاں جلوہ ترا
غیرتیں، خودداریاں جلوہ ترا
روح کی آگاہیاں جلوہ ترا
عقل کی بے تابیاں جلوہ ترا
شکل کی رعنائیاں جلوہ ترا
ذوق کی اٹکھیلیاں جلوہ ترا
شوق کی چنگاریاں جلوہ ترا
جبر سے دامن کشاں جلوہ ترا
شوقِ میرِ کارواں جلوہ ترا
پاسدارِ دوستاں جلوہ ترا
موت میں آسانیاں جلوہ ترا
آدمیت کی زباں جلوہ ترا
شیوۂ پیغمبراں جلوہ ترا
عرش پر ہے جاوداں جلوہ ترا
شش جہت ہے لامکاں جلوہ ترا
انکساری کی زباں جلوہ ترا
غم گساری کا سماں جلوہ ترا
بے کسوں کے درمیاں جلوہ ترا
ایک پل میں مہرباں جلوہ ترا
دو دلوں کے درمیاں جلوہ ترا
مسلکِ ہمت وراں جلوہ ترا
ہر جہاں پر مہرباں جلوہ ترا
حُسنِ تابِ فرق داں جلوہ ترا
حیرتِ حُسنِ جہاں جلوہ ترا
عشق کی زیبائیاں جلوہ ترا
شوق کی گل کاریاں جلوہ ترا
ذوق کا روح و رواں جلوہ ترا
عظمتِ اُفتادگاں جلوہ ترا
صلح جو، عالی نشاں جلوہ ترا

ہیبتِ شاہِ جہاں جلوہ ترا
قید میں جی داریاں جلوہ ترا
حیؑ و قائم جاوداں جلوہ ترا
دہر کا روح و رواں جلوہ ترا
تجھ سے روشن ہے شبستانِ ابد
نور سے ہے ضوفشاں جلوہ ترا
میری ہستی راہ کا مُشتِ غبار
کہکشاں در کہکشاں جلوہ ترا
میری ہستی ایک پل مسعودؔ ہے
دائم و قائم نشاں جلوہ ترا

خالد مسعود/ لاہور

نعت

زباں پر مرے میٹھا نامِ محمدؐ
بسا قلب میں احترامِ محمدؐ
پکارے سبھی انبیاءؑ مرسلیں بھی
بلندی پہ پائیں مقامِ محمدؐ
ملے برتری، بہتری، کامیابی
سبھی نامِ نامی بنامِ محمدؐ
تمنا ہمیشہ غلاموں میں پائی
پئیں سب قیامت میں جامِ محمدؐ
کرم بندہ پرور ہمیں بخشوائیں
قیامت میں بولے غلامِ محمدؐ
ملا رب بلندی پہ معراج پائی
مکاں لامکاں پر قیامِ محمدؐ
ملی کامیابی مجھے عظمتوں میں
سماعت میں میرے کلامِ محمدؐ
مرا مدعا بارگاہِ نبیؐ میں
کرم مجھ پہ مولا مدامِ محمدؐ
امیںؔ میرے آپس میں لب جب ملیں تب
پڑھوں باادب میں سلامِ محمدؐ

محمد امین ساجد سعیدی/ حاصل پور

سربسرِ روشنی سیّد الانبیاء
قاسمِ آگہی سیدالانبیاء
مالکِ دو جہاں سرورِ سروراں
پیکرِ سادگی سیّد الانبیا
رفعتِ بندگی سیدالانبیاء
مدحتِ مصطفیٰؐ مقصد زندگی
فکر کی تازگی سیّد الانبیاء
آپ کے دم سے شاداب ہے آج تک
گلشنِ زندگی سیّد الانبیاء
اپنے فیضیؔ کو بھی اب عطا کیجیے
نوکری چاکری سیّد الانبیاء

بشارت علی فیضی/

خضور آپؐ کا در آستانِ رحمت ہے
طفیل آپ کے دنیا جہانِ رحمت ہے
جنابِ پاک کی نسبت سے ہر کلی مہکی
وجود آپؐ کا گو بستانِ رحمت ہے
جدھر کو آپ نے موڑی پلٹ گئی اُس رُخ
حبیب ہاتھ میں تیرے عنانِ رحمت ہے
دِیا، وجود میں پہلے جلا محبت کا
مکانِ خاک ہوا پھر مکانِ رحمت ہے
کلامِ پاک کی صورت خدائے برتر سے
حضور آپ پہ اُترا بیانِ رحمت ہے
علیؑ و سیّدہؓ، حسنؓ و حسینؓ کا گلشن
کہ ذاتِ عالی جہاں باغبانِ رحمت ہے
حضور آپؐ ہی خلقِ عظیم پہ فائز
حضور آپؐ کا اُسوہ نشانِ رحمت ہے
گھٹا دکھائی جو دیتی ہے تیمؔ در پردہ
کہ ابر بن کے برستا خوانِ رحمت ہے

مجتبیٰ شہزاد تیمؔ/ گجرات

حضرت فاطمہؓ

جو ترے نقشِ پا کے نشاں فاطمہؓ
وہ رحمت کے ہیں آسماں فاطمہؓ
تو خدیجہ کی لختِ جگر جانِ جاں
ثانی زہرا کی تو ہے ماں فاطمہؓ
خلد کے پھول حسنین ہیں آپ کے
آپ سے مہکے ہیں گلستاں فاطمہؓ
آپ کے جب وسیلے سے مانگی دُعا
مٹ گئے میرے آہ و فغاں فاطمہؓ
مولدِ کعبہ مشکل کشا ہل اتیٰ
تیرے شوہر سا کوئی کہاں فاطمہؓ
جنتی عورتوں کی تو سردار ہے
تیرے زیرِ نگیں دو جہاں فاطمہ
میں کیوں جواد در در پہ جاتا پھروں
آپ کا مل گیا آستاں فاطمہؓ

محمد ذوالقرنین جواد حاؔلی/ حاصل پور

نعتیہ قصیدہ

محسن انسانیت (در شانِ رسولِ اعظم، نبیِ مکرم، حضورِ اکرم، نورِ مجسم ﷺ)

کلام: شاعر علی شاعر (کراچی)

ہو رہی ہے ابر کی جلوہ گری
چل رہی ہے کیا ہَوائے دل بَری
بن گیا اِک خواب نیلا آسماں
سر پہ اب کالی گھٹائیں ہیں کھڑی
لوگ خوش ہیں بادلوں کو دیکھ کر
برق اپنے ساتھ لائی روشنی
ہر طرف ہے ابرِ باراں کا ہجوم
لگ رہی ہے آج ساون کی جھڑی
ہے بپا شورِ مسرّت شہر میں
جاں فزا ساعت ہمیں راس آ گئی
ہر نظر ہے آسمانوں کی طرف
سب کی چاہت اب تو بارش ہی بنی
مٹ گیا اندیشۂ فصلِ خزاں
خیمہ زن ہے ہر جگہ اب تازگی
ہم ضرر تم کو نہ اب پہنچائیں گے
بارشوں نے کچے گھر سے بات کی
دشت و صحرا اپنے بازو کھول کر
ابر کا کرتے ہیں استقبال بھی
جنگلوں میں بھی خوشی کا ہے سماں
اور خیاباں نے بھی پائی دل کشی
شاخ، پتّوں اور شجر کے درمیاں
ابرِ رحمت میں نہانے کی ٹھنی
فرشِ گیتی بارشوں کا منتظر
اور پہاڑوں نے بھی رہ ہموار کی
وادیاں بھی جھوم اُٹھیں بے گماں
مل گئی ڈھلوان کو بھی آگہی
اِک شجر نے دوسرے سے یوں کہا
سبزۂ نورستہ کا اب جام پی
پھر اچانک سارے منظر کھو گئے
تھا نظر کے سامنے کچھ اور ہی
ہم نے دیکھا آنکھ مل کر جس طرف
دوسری دُنیا نظر آنے لگی

تھا کہیں بادل نہ بارش کا نشاں
سب کی بینائی بدل کر رہ گئی
اِن مناظر کا رکھا ہے میں نے نام
ایک جنگِ تیرگی و روشنی
تھی زمیں پر اِس بَلا کی تیرگی
ساری دُنیا ڈھونڈتی تھی روشنی
لے رہی تھی خوابِ غفلت کے مزے
نوعِ انساں تھی اسیرِ گُمرہی
بھول بیٹھی تھی خُدائے پاک کو
قوم تھی سب مبتلائے آزری
ایک انساں بھی نظر آتا نہ تھا
ڈس رہا تھا آدمی کو آدمی
پیار تھا ہر اِک برائی سے اُنھیں
تھی درندوں جیسی اُن کی دشمنی
آگہی تھی اور نہ تھا علم و شعور
جانور جیسی تھی اُن کی زندگی
عورتوں سے تھا سلوکِ ناروا
صنفِ نازک دل لگی کی چیز تھی
کھیل تھے سارے شرافت کے خلاف
جہل پر نازاں تھی اُن کی آگہی
چھینا جھپٹی اور ڈاکا شغل تھا
قتل و غارت کی روش بھی عام تھی
خالقِ اکبر کو اپنے چھوڑ کر
پوجتا تھا پتھروں کو آدمی
کر رہے تھے دفن، زندہ بیٹیاں
اِس قدر تھا ظلم، ایسی سرکشی
جان و دل احساس سے محروم تھے
ذہن سے بھی روشنی معدوم تھی
پوجتے تھے روز و شب اصنام کو
بُت گری تھی اُن کی گھٹی میں پڑی
ہو گئے حور و مَلَک بھی غم زدہ
جب سُنی یہ داستانِ گُمرہی

مہر و مہ بھی پھوٹ کر رونے لگا
دیکھ کر انسانیت کی مفلسی
دیکھ کر چرخِ کُہن نے یہ روش
اپنی آنکھوں میں سجائی تھی نمی
جب بُتوں سے بھر گیا صحنِ حرم
بڑھ گئی جب کُفر کی تیرہ شبی
خالقِ ارض و سما نے دفعتاً
رہ نمائی کی، زمیں ہموار کی
ہونے والا تھا نبوّت کا ظہور
آ گئی تھی بعثتِ حق کی گھڑی
چاند اِک چمکا، زمانے میں نیا
جس کی سیرت تھی حریفِ تیرگی
جس کا صدیوں سے تھا سب کو انتظار
آ گئی آخر وہ تابندہ گھڑی
مہر و مہ تھے منتظر دیدار کے
اوج پر تھی عشق کی دیوانگی
وہ نبوّت کا پرانا سلسلہ
مل گئی زنجیر سے اُس کی کڑی
خالقِ ارض و سما ہے ایک رب
یہ حقیقت آخرش ثابت ہُوئی
کر دیا قربان سب کچھ آپ پر
تھی صحابہ میں عجب وارفتگی
تھے نظارے ہر طرف فردوس کے
ہر طرف جنت کی تھی جلوہ گری
کل تلک ایمان جو لایا نہ تھا
کر رہا تھا آپ کی وہ پیروی
عزّت و منصب غلاموں کو مِلا
یوں ہَوا رحمت کی دُنیا میں چلی
جتنے اعدا در پئے آزار تھے
بن گئے وہ بھی غلامانِ نبی
عمر بھر جو خون کے پیاسے رہے
آبرو رکھنے لگے تھے غیر کی

شرک نے جس کو کیا تھا مُنہدم
پھر اُسی تہذیب کی تعمیر کی
کر دیا سیراب جامِ خیر سے
بجھ گئی انسان کی تشنہ لبی
رفتہ رفتہ ہو گئی پھر سے بحال
صحنِ گلشن کی معطل زندگی
جو قبیلے تھے تکبّر آشنا
مٹ گئی تھی اُن کی ساری خودسری
دیکھ کر حیران ہوتی تھی نظر
کیا عجب تھی ندرتِ تابندگی
ہر بشر کو مل گیا عرفانِ ذات
سج گیا پھر لب بہ لب حرفِ خودی
جو گھمنڈی لوگ تھے وہ لوگ اب
تھے مجسّم انکسار و عاجزی
جس زباں پر مستقل دُشنام تھے
اُس زباں نے سیکھ لی شائستگی
تھے جو ذرّے آپ کے زیرِ قدم
کر رہے ہیں مہر و مہ کی ہمسری
مفلس و نادار تھے جو کل تلک
آج وہ کرنے لگے سوداگری
یہ زمیں بنجر تھی لیکن پُربہار
آپ کے قدموں کی نسبت سے ہُوئی
آپ کے دم سے ہے توقیرِ بشر
آپ نے انسان کو پہچان دی
توڑ ڈالی ضربتِ کردار سے
سخت کتنی ظلم کی دیوار تھی
مل گئی اُس کو سزا اِک آن میں
جس نے بھی انسان کی توہین کی
قوم پہلے تھی جہالت آشنا
جہل سے اب برسرِ پیکار تھی
کس قدر حیران تھے سب دیکھ کر
محسنِ انسانیت کی سادگی
جب کوئی آیت سنائی آپ نے
مل گئی انساں کو حق کی آگہی
دل میں تھی صدیوں سے جس کی آرزو
اب وہ منظر ہو گیا تھا دیدنی
گر گئے سب کُفر کے لات و منات
اب خُدا کی بندگی ہونے لگی
اِک جہانِ خیر پیدا ہو گیا
جب ہُوئی دُنیا میں آمد آپ کی
بُت پرستی کو مٹایا آپ نے
دینِ ابراہیم کی تبلیغ کی
آپ پر نازل ہُوا قرآنِ پاک
آپ پر بارش ہُوئی اِلہام کی
ہر بشر تھا کارِ عصیاں میں مگن
آپ نے بھٹکے ہُوؤں کو عقل دی
نامِ نامی آپ کا جب بھی لیا
روح نے پائی عجب بالیدگی
جب ہُوئی اسلام کی تبلیغِ عام
پھر جہالت موت اپنی مر گئی
آپ نے بخشا نظامِ عبدیت
آپ نے تہذیبِ نَو ترتیب دی
آپ نے کامل یقیں پیدا کیا
ختم کر ڈالی حکومت وہم کی
آپ ہی تو باغبانِ دہر ہیں
آپ ہی سے کِھل اُٹھی دل کی کلی
ہر فسردہ دل کِھلا مثلِ گلاب
ذہنِ پژمردہ نے پائی تازگی
آدمی کو مِل گیا عزّ و شرف
بڑھ گیا پھر احترامِ آدمی
جو شجر پت جھڑ میں عریاں ہو گئے
سبز پتّوں کی اُنھیں پوشاک دی
کر دیا برپا عمل سے انقلاب
آپ نے کایا پلٹ دی دہر کی
جو خزاں سے منہ چھپاتی تھی بہار
وہ بیابانوں میں اِترانے لگی
جن لبوں پر تھا خموشی کا عذاب
مسکراہٹ اُن لبوں پر چھا گئی
آپ نے جب عقل و ہمت کی عطا
تب مسلماں نے عدو کو مات دی
آپ پر جاں بھی مری قربان ہے
آپ ہیں میرے نبی، پیارے نبی
ہم بھی دیتے ہیں صحابہ کی مثال
پیار تھا اُن میں، تھی پکّی دوستی
اب مدینہ اُس جگہ کا نام ہے
سر زمیں مشہور تھی جو یثربی
آج ہے سارے جہاں میں متحد
کل تلک بکھری ہُوئی جو قوم تھی
جہل کیا ہے آپ نے سمجھا دیا
آپ ہی نے علم کی ترغیب دی
دینِ فطرت کے کرم سے دیکھیے
عورتوں کو بھی فضیلت مل گئی
ہر عمل پہلے کیا خود آپ نے
رہبری دیکھی نہ اِس انداز کی
آپ کی تعلیم سے انسان کو
مِل گئے علم و شعور و آگہی
موسمِ گُل مدتوں سے خواب تھا
آپ نے گلشن کو بخشی دل کشی
واحد و یکتا خُدائے پاک ہے
آپ سے پہلے نہ تھی یہ آگہی
آپ نے راسخ کیا اذہان میں
خالقِ ارض و سما ہے ایک ہی
آپ کا بستر چٹائی کا بنا
کس قدر تھی زندگی میں سادگی
رب کی خاطر آپ نے رکھی روا
دوستی ہو یا کسی سے دشمنی
آپ سے پہلے نہ تھا یہ رنگِ زیست
آپ نے دی زندگی کو زندگی
قد غریبوں کا بڑھایا آپ نے
مل گئی نادار کو خوش قامتی
ہر زمانے کی ضرورت آپ ہیں
ہے ضرورت دو جہاں کو آپ کی

ہے دعا تجھ سے خُدائے ذُوالجلال
ہم پہ اِفشا کر رموزِ زندگی
رات دن جس سے چلا ملتی رہے
بخش وہ قلب و نظر کو روشنی
دل میں روشن کر چراغِ انکسار
ہم کو دے دے عاجزی سی عاجزی
مغفرت کی ہم کو تجھ سے آس ہے
ہم ترے محبُوب کے ہیں اُمتی
دامنِ سرکار کا ہو سائباں
جب زمیں ہو حشر میں تپتی ہُوئی
میری تکلیفیں مٹا دے اے خدا
تُو نے ہی کلفت سبھی کی دُور کی
اے خدا صدقہ نبی کی آل کا
حالتِ ابتر بدل انسان کی
جوش میں آنے لگا عرشِ بریں
یہ ہے طاقت نعتیہ اشعار کی
بچ گیا ہُوں آتشِ دوزخ سے میں
یہ بھی رحمت ہے رسولِ پاک کی
اور بخشش کا کوئی رستہ نہ تھا
کام آخر آ گئی یہ شاعری
ہاتفِ غیبی پکارا حشر میں
ہو گئی بخشش تری شاعرِ علی

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700روپے
اُردو غزل (غزل کی دوسوسالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800روپے
مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	-/200روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500روپے
اصلاح تلفظ واملاء	طالب ہاشمی	-/250روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250روپے
ولی تحقیق وتنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

مضمون

جمال الدین پانی پتی

ڈاکٹر علی محمد خاں/لاہور

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

کبھی کبھی میں گمان کرتا ہوں کہ یہ نام کا اثر تھا یا کیا کہ جمال الدین پانی پتی اور جمال الدین افغانی میں سوچ بچار اور عادات و اطوار کے اعتبار سے کس قدر مماثلت تھی۔ دونوں کا شعار خدمت گزاری اور پیغامِ محبت تھا۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ جمال الدین افغانی افغانستان کو برضا و رغبت خیر باد کہہ کر ترکی میں جاگزیں ہوئے اور انھوں نے شہرت و ناموری کی بلندیوں کو جا چھوا مگر جمال الدین پانی پتی چار و ناچار ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور ساری زندگی اپنے والدین، بہن بھائیوں، عزیز و اقارب، برادری اور اہلِ دہ کی خدمت کرتے بتا دی۔ دونوں میں ایک قدرِ مشترک اور بھی تھی، وہ یہ کہ جمال الدین افغانی نے ہندوستان سے دُور رہ کر انسانیت کے ناتے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو پیار محبت سے یکجا رہنے اور مسلمانوں کے مابین شیعہ سنی اتحاد کا درس دیا اور جمال الدین پانی پتی نے بھی اپنی حدود میں رہ کر یہی کام کیا۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے دوستوں سے مل کر پانی پت کے گردونواح میں ہندو مسلم اتحاد کی بہت کوششیں کیں لیکن اُن کی تمام کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں کیوں کہ ہندوؤں کے ذہنوں میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسا زہر اور ازلی تعصب بھرا ہوا تھا جو نسل در نسل آج تک چلا آ رہا ہے۔ جب قیامِ پاکستان کے مطالبے کا زمانہ اوج پر تھا تو انھوں نے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندو تو اپنا بھلا سوچتا ہے، نہ بُرا، اُس نے تو فقط ہندوستان میں ہندو راج کے لیے تن من دھن کی بازی لگا رکھی ہے اور اس ضمن میں وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے، تو انھوں نے بھی ہندو دوستوں سے اپنا راستہ جدا کر لیا۔

قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ قائدِاعظم نے بھی کسی زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کی سر توڑ کوششیں کی تھیں اور وہ "ہندو مسلم اتحاد کے سفیر" کہلاتے تھے مگر انھوں نے بھی جلد ہی ہندو بنیے کی مکاری اور لالہ دال خور کی عیاری کو بھانپتے ہوئے اپنی آزادی کی راہ جدا کر لی تھی۔

جمال الدین پانی پتی میرے برادرِ اکبر تھے۔ برادرِ اکبر نہیں بلکہ مجھے انھیں برادرِ بزرگ کہنا چاہیے کیوں کہ ہماری والدہ محترمہ ماں جی، جن کا خاکہ میں (راقم الحروف) نے آج سے بارہ سال پہلے لکھا تھا، بتایا کرتی تھیں کہ تم میں اور جمالو میں سولہ سال کی چھوٹ بڑائی ہے، جب تم پیدا ہوئے تھے تو اس وقت وہ حالی مسلم ہائی سکول پانی پت میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے برادرِ بزرگوار کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب ہمارے والدِ گرامی کا، جنھیں ہم باپو جی کہا کرتے تھے، ایک سو سات سال کی عمر میں کو انتقال ہوا تو ہمارے دونوں ماموں: خدا بخش اور عبدالغفور شورکوٹ سے ہمارے گاؤں میترانوالی (ڈسکہ) آئے تھے اور سوگ ختم ہونے کے تیسرے دن انھوں نے باپو کی پگڑی بڑے بھائی کے سر پر باندھی تھی، جس کا سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ اب جمال الدین ہی اس خاندان کا سربراہ اور سب کے لیے واجب التعظیم ہیں۔

بھائی جمال الدین کی صحیح تاریخ ولادت کا تو علم نہیں، کاغذوں میں جو لکھی گئی، سو لکھی گئی۔ شناختی کارڈ پر ان کی تاریخِ پیدائش ۲۔جنوری ۸۲۹۱ع اور نام جمال محمد خاں درج ہے۔ واللہ اعلم بالصواب، مگر اب تو اسے ہی درست تسلیم کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس وقت وہ ساڑھے انیس سال کے تھے۔ ماں جی بھی یہی کہا کرتی تھیں کہ جب پاکستان بنا تو جمال الدین کی عمر انیس بیس سال کی تھی اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا نصراللہ خاں میری گود میں تھا۔ برسبیلِ تذکرہ ماں جی یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ میرے تمھارے باپو کے نکاح میں آنے سے پہلے ان کی پہلی دو بیویاں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ پہلی بیوی تو، جس کے چار پانچ بچے بھی تھے، اس وقت مری تھی، جب تمام ہندوستان میں طاعون کی وبا پھیلی تھی اور گاؤں کے گاؤں بے چراغ ہو گئے تھے۔ دوسری بیوی مع اپنے چار بچوں کے اس وقت داغِ مفارقت دے گئی تھی، جب ہندوستان بھر میں ہیضے کی وبا پھیلی تھی۔ اس وقت تمھارے باپو کے گھر میں چھے سات سال کی ایک لڑکی بچ گئی تھی جس کا نام "مونا" تھا۔ میں جب اس گھر میں ڈاہر (پانی پت) کے نواحی گاؤں ماجرا (پانی پت) سے بیاہی آئی تھی تو میری عمر سولہ سترہ سال جب کہ تمھارے باپو ادھیڑ عمر تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے میرے یہاں جمال الدین پیدا ہوا تو چونکہ یہ بچہ انتہائی خوبصورت تھا، اس لیے اس مناسبت سے اس کا نام تمھارے دادا خدا بخش نے جمال الدین رکھا۔ جمال الدین ابھی میری گود ہی میں تھا تو پانی پت میں تعزیے کا موقع آ گیا اور میں نے اسے دوسری ضعیف الاعتقاد عورتوں کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے، اُس کی صحت مندی اور طویل عمری کے ارمان میں بہزار دقت ذوالجناح کے نیچے سے گزارا۔

جب ملک کا بٹوارا ہوا تو میری (راقم الحروف کی) عمر چھے سال سے زیادہ نہ تھی (تاریخِ ولادت بہ مطابق شناختی کارڈ: ۷۔ستمبر ۱۴۹۱ع) مجھے وہ زمانہ فقط ایک دھندلے خواب کی مانند یاد ہے مگر بھائی جمال بتایا کرتے تھے کہ ہم پانی پت سے بجانب دِلّی چار پانچ میل کی دوری پر سو ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی آبادی "ڈاہر" میں رہتے تھے۔ ہمارے پُرکھوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کا نام دیبل (سندھ) کے راجا داہر کے نام سے معنون کرتے ہوئے رکھا تھا اور ہم لوگوں کے جدِّ اعلیٰ کا، جن کا نام، مامل سنگھ عرف مامڑا تھا اور جو ہندو دھرم کے پیروکار

تھے، مسکن بھی ملتان یا گردونواح کا علاقہ تھا جہاں انھوں نے اُچ شریف کے کسی بزرگ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوکر اپنے بھائی بندوں کے ہاتھوں بڑے ظلم سہے تھے اور جان بچا کر چھپتے چھپاتے ملتان سے ترکِ سکونت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔

بھائی جمال بتایا کرتے تھے کہ ڈاہر کی دو تہائی آبادی ہندوؤں اور ایک تہائی مسلمان گھرانوں پر مشتمل تھی جب کہ تین چار گھر نیچ ذات دھانکوں کے تھے جو آبادی سے قدرے فاصلے پر رہتے تھے۔ جہاں انھوں نے خنزیروں کے باڑے بنا رکھے تھے۔ گاؤں میں اونچی کرسی کی ایک خاصی کشادہ مسجد تھی۔ جب کبھی کبھار دریائے جمنا بپھر جاتا اور سیلابی پانی ڈاہر تک آ جاتا تو یہی مسجد لوگوں کے لیے جائے پناہ بن جاتی۔ بالعموم ہمارے باپو ہی مسجد میں اذان دیتے اور مولوی صاحب کی عدم موجودگی میں جماعت کرا دیا کرتے تھے۔ وہ بڑے خوبرو، تنومند، جفاکش، محنتی اور ہمّت کے دھنی تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ رہی تھی کہ وہ ہر سال گرمیوں کے خشک موسم میں سنگی لگوایا کرتے، فصد کروایا کرتے اور مسہل لیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ میرے نبیؐ کی سنّت ہے۔ ان کی بلند ہمّتی کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہ دو بار ڈاہر سے دِلّی، جو ڈاہر سے اتنا دور ہے جتنا لاہور سے گوجرانوالا، پاپیادہ گئے تھے۔ وہ ہر دو بار پَو پھٹنے سے پہلے ڈاہر سے روانہ ہوئے اور سنبھالکھا اور سونی پت ہوتے ہوئے رات گئے دِلّی پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار تو انھیں دِلّی سے واپس ڈاہر اس لیے بھی پیدل آنا پڑا تھا کہ شومئ قسمت سے دِلّی کے چاندنی چوک یا قاضی کے حوض میں ایک بازی گر کے کرتب دیکھنے کے دوران میں، جب مجمع لگا ہوا تھا، کسی جیب تراش نے ان کی جیب کاٹ لی تھی اور ان کے پاس ایک پیسا بھی نہیں بچا تھا۔

بھائی جمال جب کبھی اپنے بچپن کی باتیں بتایا کرتے تو بڑے جذباتی ہو جاتے اور کہا کرتے تھے کہ تم کیا جانو کہ پڑھائی کیسے ہوتی ہے۔ میں نے اپنے گاؤں میں ایک پادھا (پنڈت) سے اتنا پڑھا کہ پرائمری کی سطح کی لیاقت پیدا کر لی تو میں نے حالی مسلم ہائی سکول پانی پت میں داخلہ لے لیا۔ سردی ہو یا گرمی، آندھی ہو یا بارش، میں روزانہ پیدل ہی چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے پڑھنے کے لیے پانی پت جاتا تھا۔

بھائی جمال بتایا کرتے تھے کہ ''ہمدرد'' کے حکیم سعید اور ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید رشتے میں ہمارے باپو کی پھوپھی کے بیٹے تھے جو پہاڑ گنج میں رہتے تھے۔ وہاں حکیم سعید کے علاوہ ہمارے عزیزوں ہی میں سے دیگر پانچ چچاؤں کے بھی مطب تھے جن کے نام: حکیم نثار احمد، حکیم فضل احمد، حکیم بشیر احمد، حکیم لطیف احمد اور حکیم حافظ شریف احمد تھے۔ برسبیلِ تذکرہ اس موقع پر ایک پُرلطف واقعہ بھی سن لیجیے:

ہُوا یوں کہ باپو کے بڑھاپے میں جا کر گھٹنے خراب ہو گئے تھے۔ لاکھ دوا دارو کیا۔ بجلی کے ٹرانسفارمروں کا تیل تک گھٹنوں پر لگایا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ: ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' انھیں کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ بھائی جمال نے مشورہ دیا کہ ''ہمدرد'' والے حکیم سعید ایک بڑے حاذق حکیم ہیں۔ وہ ہر ماہ تین دن کے لیے کراچی سے لاہور آ کر مطب کرتے ہیں۔ اُن دنوں ان کا مطب فین روڈ پر بیگم سلمٰی تصدق حسین کی کوٹھی سے متصل ہوا کرتا تھا، جہاں مریضوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ خیر ہم دونوں بھائی باپو کو حکیم سعید کے پاس لے گئے۔ باپو نے حکیم صاحب کو دیکھتے ہی کہا: ''ارے! تُو منّتی کا بیٹا ہے؟'' حکیم سعید کا ایک باریش بزرگ کے منہ سے اپنی ماں کا نام سننا تھا کہ چونک پڑے اور بڑی دیر تک باپو کے ساتھ اپنی ماں اور بڑے بھائی حکیم عبدالمجید کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ اُن دنوں حکیم انوار الٰہی حکیم سعید کے پاس بیٹھے اُن کے نسخے لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے باپو کو نسخہ لکھ دیا جس کی زد سے انھیں سیکڑوں روپے کی دوائیاں بھی مفت مل گئیں مگر باپو کو آرام نہ آیا اور وہ کئی دنوں تک حکیم صاحب کو جن الفاظ میں برا بھلا کہتے رہے، اُن کا یہاں نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔

جن دنوں میں (راقم الحروف) شاید گاؤں کے ہائی سکول کی دسویں جماعت میں پڑھا تھا تو میں نے اپنے ایک استاد مولوی عبدالغنی کی زبانی، جو بڑے خوش نویس اور ہمیں ''سرمایۂ اردو'' پڑھایا کرتے تھے، خواجہ الطاف حسین حالی اور پانی پت کا نام سنا تو پانی پتی ہونے کے ناتے میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے بھائی جمال سے، جو اُن دنوں بطور پٹواری ملازمت کرتے اور ملازمت کے ساتھ ساتھ ادیب عالم کا امتحان بھی دے رہے تھے، مولانا حالی اور پانی پت کے بارے میں دریافت کیا تو بھائی نے بتایا کہ ہمارے باپو کا ایک دراز عرصے تک یہ دستور رہا کہ وہ بُو علی قلندر کی مسجد میں ہر جمعے کی نماز کے بعد نزدیکی محلّہ خواجگان میں حافظ خواجہ ایزد بخش اور حافظ خواجہ الطاف حسین حالی کی مجلس میں ضرور شریک ہوتے رہے تھے۔ ان کی مولانا حالی کے ساتھ اچھی بھلی شناسائی تھی۔ بھائی جمال مزید بتایا کرتے تھے کہ جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو ڈاہر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ ڈاہر سے تین چار میل کے فاصلے پر صرف مسلمانوں کا تقریباً سو گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام ہرتاڑی تھا۔ جس پر ہندو اور سکھ مسلح جتھے بنا کر چڑھ دوڑے اور وہاں کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ فوراً شُدھ ہو جائیں، ورنہ ان کی خیر نہیں۔ جب انھوں نے شُدھ ہونے سے صریحاً انکار کیا اور شہادت کو ترجیح دی تو ان ظالموں نے گاؤں کے مرد، عورت، بچّے، بوڑھے سب تہ تیغ کر دیے اور سب لوگ شہادت سے لذّت آشنا ہوئے، ظالموں نے ایک متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے مواقع کے لیے ہی تو کہا ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

اس کے ایک ہفتہ بعد ان لوگوں نے ڈاہر کا رخ کیا۔ ہمارے گاؤں کا مکھیا ایک عمر رسیدہ مگر خدا ترس اور عاقبت اندیش ہندو تھا، جس کا نام چندگی رام تھا، اُس نے حملہ آوروں کو بہ مشکل قتل گردی سے روکا کہ کہا

کہ ڈاہر کے تمام مسلمانوں کے اجداد کا تعلق کسی زمانے میں ہندو دھرم سے تھا جو مسلمان حکمرانوں کی تلوار کے خوف سے مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کی تمام رسوم و روایات ابھی تک ہندووانہ ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی رضا سے دوبارہ شدھ ہو جائیں اور ہندو دھرم قبول کر لیں تو انھیں کچھ نہ کہا جائے۔ پھر یہ ہمارے بھائی بن جائیں گے اور تمام معاملات میں ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہو جائیں گے، چنانچہ ڈاہر کے تمام مسلمان گھرانوں کے سرپرستوں نے چوپال میں کھڑے کھڑے ہرتاڑی کے المناک سانحے کے پس منظر میں اسی وقت ہندو دھرم قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ڈاہر قتل و غارت گری سے بچ گیا۔ بھائی نے بتایا کہ گاؤں کے پنڈت نے باپو کا نام منگت علی خاں سے منگت رام، جمال کا جے رام، جمیلہ خاتون کا رام پیاری اور چھوٹے بھائی نورالدین کا، جو پاکستان میں آ کر اگلے ہی سال فوت ہو گئے تھے، چھوٹو رام رکھ دیا۔ ماں جی کے نام کے بارے میں کہا کہ اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں، اس نام کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ تمام گھر بالخصوص رسوئی میں گنگا جل چھڑکا گیا، جسے گاؤں کا پنڈت ایک لٹیا میں اپنے ساتھ لایا تھا اور پوجا پاٹ شروع ہو گئی اور زندگی نے دہشت اور خوف کے سائے میں سکھ کا سانس لیا۔ بھائی بتایا کرتے تھے کہ اس کے باوجود بھی میں چوری چھپے حسبِ معمول ہر روز نور کے تڑکے قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا اور قرآن مجید کو غلاف میں لپیٹ کر گندم کے بھوسے (توڑی) میں چھپا دیا کرتا تھا۔ اسی دوران میں بھائی کے ساتھ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا واقعہ بھی پیش آیا: ہوا یوں کہ انھیں کسی ناگزیز کام کے سلسلے میں ڈاہر سے پانی پت جانا پڑا۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو ان کا گزر نہر جمن غربی سے نکلنے والے ایک راجباہے کے پل پر سے ہوا۔ پل پر ناکا لگا ہوا تھا۔ بھائی وہاں پکڑے گئے۔ انھوں نے نام پوچھا تو بھائی نے اپنا نام جے رام بتایا مگر وہ شکل و شباہت سے ہندو نہیں لگ رہے تھے۔ دھوتی کھولی تو دیکھا کہ ان کی تو ختنہ ہوئی ہے اور وہ مسلمان ہیں چنانچہ انھیں قتل کرنے کے لیے تار بابو کی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ کوٹھڑی میں ایک روشن دان تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی بھائی کسی نہ کسی طرح روشن دان کے راستے کوٹھڑی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹا پیٹ کے بل رینگتے رینگتے اور بلوائیوں کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر گاؤں پہنچے۔

بھائی جمال کا بیان ہے کہ ان کا تقریباً دو ہفتے تک یہی معمول رہا کہ وہ پوجا پاٹ کے لیے مندر آتے جاتے رہے مگر نہ جانے کیوں ذاتِ باری تعالیٰ پر، جس کے قبضۂ قدرت میں یہ آسمان، یہ زمین اور کائنات کی ہر شے ہے، یقینِ کامل تھا کہ وہ ہماری پکار ضرور سنے گا۔ چنانچہ ایک دن ایسا ہوا کہ بلوچ رجمنٹ کے دو ٹرک ہمارے گاؤں میں آئے اور فوجیوں نے کہا کہ جو لوگ پاکستان جانا چاہیں، ان کے لیے پانی پت میں کیمپ لگا ہے، انھیں وہاں بحفاظت پہنچایا جائے گا اور وہاں سے پاکستان جانے کے لیے ٹرین میں روانہ کر دیا جائے گا۔ باپو اور بھائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی جانوں کو لے کر بھرا پُرا گھر بار اسی طرح چھوڑا اور ان کے ساتھ ملٹری کے ٹرک میں بیٹھ کر پانی پت روانہ ہو گئے اور گاؤں کے ہندو منھ دیکھتے رہ گئے۔

بھائی جمال کا بیان ہے کہ ہم تین دن تک پانی پت کے مہاجر کیمپ میں بے یار و مددگار پڑے رہے مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے کہ مال نہ سہی، جانیں بچ گئیں اور ایمان کی سلامتی کا بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تین دن بعد اَن گنت بوگیوں پر مشتمل ہماری لمبی سی ٹرین پانی پت سے لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ بھائی بتایا کرتے تھے اور راقم الحروف کو بھی کسی دھند کے خواب کی مانند یاد ہے کہ سردیوں کی چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہماری ٹرین ایک ویرانے سے گزر رہی تھی تو دیکھا کہ آگے ریلوے ٹریک اکھڑا ہوا ہے۔ لامحالہ ٹرین رُک گئی تو دونوں طرف کی جھاڑیوں میں چھپے لاتعداد سکھوں کے جتھے کرپانیں اور تلواریں لہراتے ہوئے قتل و غارت گری کے لیے یہ کہتے ہوئے ٹرین پر پل پڑے کہ آج ہم دھرتی ماتا کو مسلوں سے پاک کریں گے۔ ٹرین کا ڈرائیور، دونوں فائر مین اور گارڈ تمام کا تمام سٹاف ہندو تھا۔ انھوں نے بلوائیوں کو ربّ اور بھگوان کی سوگندیں دے کر بڑی مشکل سے روکا اور انھیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ اس وقت لاہور اسٹیشن پر ہندوؤں اور سکھوں سے بھری ہوئی دو ٹرینیں کھڑی ہیں۔ یہ ٹرین پہنچے گی تو وہ دو ٹرینیں چلیں گی۔ اگر تم یہ ٹرین لاشوں سے بھر دو گے تو لاہور کے مسلمان اُن دونوں ٹرینوں کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تمھارے لیے یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ کہتے ہیں کہ اَن پڑھ سکھوں کی اوپر والی منزل بالعموم خالی ہوتی ہے مگر وہ اپنے سرداروں کے منع کرنے سے باز رہے پھر بھی انھوں نے ماؤں کی گودوں میں سے چھین کر چند بچوں کے جگر چھلنی کر دیے۔ اکھڑی پٹڑی جوڑی گئی اور خدا خدا کر کے ہماری ٹرین لاہور پہنچی۔ اس تمام واقعے میں پُرلطف بات یہ ہے کہ لاہور اسٹیشن پر کوئی ٹرین نہ کھڑی تھی بلکہ ٹرین کے ان ہندوؤں نے مسافروں کی جانوں کی حفاظت کو اپنا دھرم جانتے ہوئے جھوٹی قسمیں کھائی تھیں اور سوائے چند بچوں کے دس گیارہ ہزار مسلمانوں کو بچا لیا تھا۔

قارئین! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مسلمان معاشرے میں اَن گنت ایسے لوگ ہیں جن کا کام دن رات معصوم لوگوں کو دھوکا دینا ہے یا پھر بے شمار ایسے لوگ ہیں جو سبیلوں کے زنجیر بندھے سٹیل کے گلاس تو درکنار راتوں کو گٹروں کے ایسے ڈھکنے بھی غائب کر دیتے ہیں جن کے ساتھ زنجیر بندھی نہیں ہوتی یا پھر ایسے "جہازوں" کی بھی کمی نہیں جو ہر وقت آسمان میں اُڑتے رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ کلمہ گو ہونے کے ناتے جنّت کے ٹھیکیدار ہیں اور وہ چاروں پانچوں ہندو جہنّم کا ایندھن بنیں گے جنھوں نے اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر چند جھوٹی قسمیں کھائیں مگر اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہوئے دس بارہ ہزار مسلمانوں کی جانوں کو بچا لیا۔ بالآخر میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بقول عزیز صفی پوری:

کوئی ہے مومن، کوئی ہے ترسا، خدا کی باتیں خدا ہی جانے
عجب طرح کا ہے یہ تماشا، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(جاری ہے)

مضمون

احمد فراز

جمیل یوسف/مری

شاعروں میں جو شہرت' عزت اور دولت احمد فراز نے کمائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کسی اور شاعر کو زندگی میں وہ بے پناہ محبت اور وہ والہانہ عقیدت نہیں ملی جو احمد فراز کے حصے میں آئی ہے۔ اقبال اور فیض کی بات الگ ہے وہ بلاشبہ فراز کے مقابلے میں کہیں بڑے شاعر تھے۔ ان کی زندگی میں بھی ان کی شہرت اور مقبولیت کچھ کم نہ تھی مگر ان کی پذیرائی اور ان کی اہمیّت کی سطح کچھ مختلف نوعیت کی ہے۔ جتنی بے شمار محفلوں اور مشاعروں میں احمد فراز کو سنا گیا اس کی کوئی نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اردو شاعری پر ہی کیا منحصر ہے اس کی کوئی مثال عالمی ادب کے تناظر میں بھی نہیں ملتی۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا شہر ہو جہاں احمد فراز پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور نہ کئے گئے ہوں۔ ہر جگہ ایک بار نہیں اسے بار بار مدعو کیا گیا اور ہر بار اس کے چاہنے والوں اور اس کو سننے کیلئے آنے والوں کی تعداد اور ان کا شوق اور جذبہ پہلے سے بڑھ کر دیدنی ہوتا تھا۔ دنیا بھر میں کہیں کوئی شعری محفل منعقد ہو رہی ہو' اس کی کامیابی اور غیر معمولی اہمیّت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہوتی کہ احمد فراز اس میں شرکت کر رہا ہے۔ لوگ اسے دیکھنے اور سننے کیلئے یوں ٹوٹ پڑتے جیسے وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہو' کوئی عجوبہ ہو۔ ہر مشاعرے کے بعد اس کے چاہنے والے' خصوصاً نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اسے گھیر لیتے اور اس سے آٹوگراف لیتے۔ اس سے مصافحہ کرتے۔ ایک بیگم سرفراز اقبال ہی نہیں' شعروسخن کا ذوق رکھنے والی ہر حسینہ اس کو اپنے ساتھ لے چلنے کے لئے بے تاب نظر آتی۔ کشور ناہید لکھتی ہے ''چاہے میرا گھر رائل پارک والا تھا کہ کرشن نگر والا کہ اقبال ٹاؤن والا۔ ہر گھر فراز کا اپنا گھر تھا'' وہ ہر چاہنی والے اور چاہنے والی کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا۔

آپ نے شاید وہ تصویر دیکھی ہو جس میں ملکہ ترنم نور جہاں سراپا آنکھ بن کر اسے دیکھ رہی ہے اور فراز اس پر جھکا ہوا ہے۔ شاید ہی نور جہاں کی کوئی اور ایسی تصویر ہو جس میں وہ اتنی محبت' اپنائیت اور خود سپردگی سے مجسم شوق بن کر کسی کو دیکھ رہی ہو۔ میں نے فراز کے سامنے کئی حسیناؤں کو اسی طرح پگھلتے دیکھا ہے۔ ابھی تک طاہرہ سید کی وہ ادا میرے ذہن پر نقش ہے جس کا اظہار صرف اس کی آواز کے لوچ سے ہی نہیں بلکہ اس کے ہر انداز سے ہو رہا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے پی ٹی وی پر فراز کی موجودگی میں کسی دیوداسی کی طرح اس کے سامنے بیٹھ کر یہ غزل گائی تھی:

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض فراز کی غزل ہی نہیں گا رہی بلکہ اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہی ہے اور وہ بت جس کے بارے میں وہ کہہ رہی ہے کہ وہ بت ہے یا خدا' دیکھا نہ جائے' اس کے سامنے بیٹھا ہے۔

احمد فراز شاعر تھا مگر کسی ہر دلعزیز فلمی ہیرو کی طرح وہ حسیناؤں کے دل کی دھڑکن بنا رہا۔ وہ جیتے جی پرانی داستانوں کا کوئی کردار لگتا تھا۔ ظفر اقبال نے اس پر اپنے مضمون کا عنوان ''ملک سخن کا شہزادہ'' رکھا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ایک لی جنڈ (Legend) بن چکا تھا۔ اس نے خود کہا ہے۔

اس سے بڑھ کر کوئی انعام ہنر کیا ہے فراز
اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ ہو جائے

آیئے دیکھتے ہیں کہ احمد فراز کی غیر معمولی شہرت اور بے تحاشا مقبولیت کے اسباب کیا تھے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی کوئی واقعہ بے سبب رونما نہیں ہوتا۔ پھر اس بات کی اہمیت بھی اپنی جگہ ہے کہ کوئی خاص واقعہ تاریخ کے کس موڑ پر اور کن حالات میں ظہور پذیر ہوا۔

رباعیات عمر خیام کی غیر معمولی اور بے تحاشا مقبولیت کا آغاز اس وقت ہوا جب ان رباعیات کا انگریزی میں جو ترجمہ فٹز جیرالڈ نے کیا تھا انگلستان میں پھیلا۔ عمر خیام کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی دنیا کا کوئی اور شاعر اس سے زیادہ مشہور و معروف ہوا ہو۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں جس کثیر تعداد میں رباعیات عمر خیام کے تراجم کئے گئے ہیں اس کی کوئی دوسری مثال عالمی ادب کی تاریخ میں موجود نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عمر خیام دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اہل ایران کو تو عمر خیام کی شاعرانہ عظمت کا ادراک یورپ والوں نے کرایا۔ وہ تو اسے ایک ریاضی دان' منجم اور فلسفی سمجھتے تھے۔ ان کیلئے وہ اب بھی شاعر سے زیادہ حکیم عمر خیام ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ یورپ والوں نے جب رباعیات عمر خیام کو دریافت کیا اس زمانے میں وہاں صنعتی انقلاب کی پیدا کردہ ہوس زر اور دنیا طلبی کے خلاف نوجوان نسل میں ایک قسم کا سماجی اور نفسیاتی ردعمل نمودار ہو رہا تھا۔ عمر خیام کا نظریۂ حیات اور اس کے تصورات ان ذہنی رجحانات کے عین مطابق تھے جو وہاں تعلیم یافتہ طبقے کے شعور میں جنم لے رہے تھے۔

یہ زمانہ رباعیات عمر خیام کی مقبولیت کیلئے بڑا موزوں تھا۔ عمر خیام کی شہرت و مقبولیت میں ان اسباب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کا تعلق معروضی حالات سے ہے۔ یہ محرکات ایسے تھے جو اس کی شاعری کے بطون سے نہیں پھوٹے تھے۔ اس کی شاعری کی خوبیاں اپنی جگہ موجود تھیں مگر سات ساڑھے سات سو سال تک بطور شاعر وہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ ان معروضی حالات کے ساتھ ساتھ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اس وقت پرنٹنگ پریس کے ذریعے کتابوں کی نشر و اشاعت نے بھی اس کے کلام کو پھیلانے اور اس کی شہرت و مقبولیت کے دائرے کو روز افزوں وسعت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

شعر و سخن کے مخصوص ادبی حلقوں سے باہر عام پبلک میں احمد فراز کے مشہور ہونے کا زمانہ ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے۔ اس سال احمد فراز کے دوسرے شعری مجموعے درد آشوب کو سال گزشتہ کی بہترین شعری کاوش قرار دیتے ہوئے آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ اس خبر نے ملک بھر کے اہل ذوق خواتین و حضرات کو احمد فراز اور اس کی کتاب درد آشوب کی طرف متوجہ کیا۔ احمد فراز کا پہلا مجموعہ ''تنہا تنہا'' آٹھ سال قبل ۱۹۵۸ء میں چھپ چکا تھا مگر توجہ کا مرکز اسے درد آشوب نے ہی بنایا۔ اس زمانے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے سیلاب نے اس طرح لوگوں کو گھیرے میں نہیں لے رکھا تھا' جیسا حال آج کل ہے۔ ٹیلی ویژن تو غالباً ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ اخبارات بھی کم کم تھے۔ لوگوں کے پاس فراغت ہوتی تھی۔ ادبی رسائل اور کتابیں پڑھنے کیلئے وقت ہوتا تھا۔ آدم جی ادبی ایوارڈ کا سلسلہ بھی نیا نیا شروع ہوا تھا۔ انعام دینے میں ڈنڈی مارنے کا رواج ابھی نہیں پڑا تھا۔ درد آشوب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ شعر و سخن کا شوق رکھنے والے ہر شخص کو فراز کی غزلوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ رسائل میں اس کتاب کی تعریف و توصیف میں تبصرے شائع ہوئے۔ اخبارات میں ان تقاریب کی خبریں چھپنے لگیں جو ایوارڈ ملنے کے حوالے سے احمد فراز کے اعزاز میں منعقد ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد مہدی حسن کی جادو بھری آواز میں احمد فراز کی غزل ''اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں'' فضاؤں میں ہر طرف گونجنے لگی۔ اس کے اشعار شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے ہر شخص کی زبان پر تھے۔ پہلے شعر نے ہی کالج کے نوجوان طلبا اور طالبات کو جکڑ لیا۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

کتابوں میں سوکھے ہوئے پھولوں کا ملنا ایک ایسا امیج تھا جس سے ہر نوجوان طالبعلم بخوبی آشنا تھا۔ ہر کسی کو اپنے دل کی بات لگتی تھی۔ اس غزل کے اکثر شعروں میں کالجوں اور یونیورسٹی کی فضا سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

یہ حریت فکر اور آزادیٔ اظہار کی بات تھی۔ ہر کسی کے دل کو لگی۔ اس غزل کا ہر شعر زبان زد خاص و عام ہوگیا۔ عطاء الحق قاسمی کا کہنا ہے کہ ہم ان دنوں کالج میں فراز کا یہ شعر سنا کر لڑکیوں کو چھیڑا کرتے تھے۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج تک یہ دلیل کسی اور شاعر نے نہیں دی تھی۔ اس غزل میں فراز کے تخلیقی ذہن نے ایک اور دلیل کا بھی اختراع کیا:

غم دنیا بھی غم یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

بے شمار قارئین اور سامعین کو اس شعر میں دی گئی دلیل کا بھی ذاتی تجربہ تھا۔ مہدی حسن کی آواز میں یہ غزل ہر طرف گونجنے لگی۔ فراز کا نام ہر اس شخص تک پہنچ گیا جس نے پہلے یہ نام نہیں سنا تھا۔

یہاں احمد فراز کے بارے میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس کی شخصیت میں شروع سے ہی کچھ ایسی کشش تھی کہ جس محفل میں بھی شعر سناتا تھا لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ عابد حسن منٹو ۱۹۶۰ء سے بھی پہلے کی ایک محفل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''انجمن ترقی پسند مصنفین کی پشاور شاخ نے غالب کے حوالے سے ایک تقریب منعقد کی۔ جس کے بعد مشاعرہ تھا۔ مہمان خصوصی عبدالحمید عدم تھے۔ رضا ہمدانی' فارغ بخاری' خاطر غزنوی اور کئی دوسروں کے علاوہ احمد فراز بھی تھا۔ گھنگھریالے بالوں والا شرمیلا سا نوجوان۔ اس مشاعرے میں شاید وہ سب سے کم عمر شاعر تھا۔ اس نے اپنا کلام سنایا تو بس مشاعرہ اسی کا ہو گیا''۔

سید ضمیر جعفری نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ایبٹ آباد میں کوئی مشاعرہ تھا۔ جہاں لوگوں نے احمد فراز کو پہلی بار سنا اور داد دی۔ مشاعرے کے اختتام پر نوجوانوں نے آٹو گراف کیلئے اس پر اس قدر ہجوم کیا کہ مشاعرے کے منتظمین کو انتظار کرنا پڑا کہ احمد فراز فارغ ہوتا کہ اس سمیت وہ سب مہمان شعرا کے ہمراہ مشاعرہ گاہ سے نکلیں۔

پروین شاکر نے فراز پر اپنے مضمون میں خوبصورت لڑکیوں کی محفلوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اس کے ہم عصر شعرا کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ فراز انہیں اپنی سکرین بیوٹی سے مات دے جائے

گا''۔

دردآشوب کے چھپنے سے پہلے ہی ادبی حلقوں میں فراز کی غزلوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے حوالے سے اس کی کئی کہانیاں موضوع گفتگو بن رہی تھیں۔ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ فارغ بخاری کے الفاظ میں ''اس کے مداحین کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ جن میں خواتین کی اکثریت ہے' لڑکیاں اس کے نام وکلام کی دلدادہ ہیں۔ وہ جس مشاعرے میں بھی جائے لڑکیاں آٹوگراف لینے کیلئے اس کا ایسا گھیراؤ کرتی ہیں کہ بچ کر نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ویسے عورت اس کی کمزوری بھی ہے اور اس کی زندگی اور شاعری کا محور بھی۔ اس کے معاشقوں کا کوئی شمار نہیں۔ وہ نت نئے شکار پھانسنے میں مشاق ہے اور اب تو اسے اس تکلف کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ شکار خود اس تاک میں رہتے ہیں: 'بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد'

لڑکیاں سگریٹ کے نئے برانڈ کی طرح اس کے بریف کیس میں سجی رہتی ہیں۔ جس برانڈ کو جی چاہا' پیکٹ کھول کر سلگایا اور چند کش لے کر اسے پھینک کر دوسرے برانڈ کا سگریٹ سلگا لیا۔ آوارگی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا یا کسی ایک چیز پر قناعت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں' اسی میں اس کی فنی ترقی کا راز ہے''۔

کشور ناہید یہ گواہی دیتی ہے کہ احمد فراز ''بے ایمان نہیں البتہ عورت کے بارے میں نیت خراب رکھنے کی عادت کو وہ چھپاتا نہیں ہے''۔

احمد فراز کے اس کردار نے اسے ایک افسانہ بنائے رکھا۔ اس کو جاننے اور اس کو چاہنے والوں کی تعداد اور ان کی دلچسپی اور تجسس میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔

''اب کہ ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں'' ابھی فضاؤں میں گونج رہی تھی کہ مہدی حسن کی آواز میں فراز کی ایک اور غزل لہرائی:

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

لوگوں کو پہلی دفعہ غزل کی گائیکی میں مہدی حسن کی بے خود کر دینے والی آواز میں اس طرح کے سادہ اور فوراً دل میں اتر جانے والے اشعار سننے کو ملے۔ اس سے پہلے اساتذہ کی جو غزلیں گائی جا چکی تھیں ان کے الفاظ اور تراکیب عام آدمی کیلئے مانوس نہ تھیں۔ فیض کی غزل بھی' چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے' عام سننے والوں کے سروں پر سے گزر جاتی تھی۔ انہیں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ گلشن کون ہے اور اس کا کاروبار کیا ہے۔ فراز کے اشعار اس کے مقابلے میں فوراً سمجھ آ جانے والے اور دل پر اثر کرنے والے تھے۔ سننے والوں کو ایسا لگتا جیسے یہ ان کے اپنی تجربات اور محسوسات ہیں جو خوبصورت شاعری آہنگ میں ڈھل گئے ہیں۔

ے وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

بعض ثقہ اہل زبان کے نزدیک یہ ایک پٹھان کا اسلوب بیان سہی مگر سننے والوں کو بھلا لگتا ہے۔ فراز کے اشعار ایسے ہیں جیسے کوئی شخص بلا تکلف اور بے ساختہ اپنے دل کی بات کہہ رہا ہو۔ اپنی محبت کی کہانی بیان کر رہا ہو۔ اپنی محبوبہ کی باتیں کر رہا ہو۔ محبت کی داستان ویسے بھی دلچسپ ہوتی ہے۔ ہر کوئی سننا چاہتا ہے۔ فراز نے یہ داستان سنانے میں مشکل اور گنجلک الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے کام نہیں لیا۔

جس طرح غالب کا یہ شعر:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالب کے کلام کے عمومی رنگ سے مختلف ہے۔ اسی طرح فراز کے اشعار باقی شاعروں اور اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں بالکل سادہ اور عام فہم ہیں۔ اس کے اشعار شعر بنانے کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں لگتے۔ اس کا اسلوب ایسا ہے جیسے کوئی دوستوں سے گفتگو کر رہا ہو۔ وہ جو کسی نے شعر کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''از دل خیزد و بر دل ریزد'' یعنی جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل کو لگتی ہے۔ یہی خوبی بدرجۂ اتم فراز کی شاعری میں ہے۔

۱۹۷۰ء کے لگ بھگ مہدی حسن نے فراز کی یہ مشہور زمانہ غزل گائی ''رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ'' یہ غزل جادو کی طرح سر چڑھ کر بولی۔ محبت کے جن سچے اور معصوم جذبات کا اظہار اس غزل میں ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ محبت کی یہ باتیں کسی فرہاد یا مجنوں کی داستان کا حصّہ نہیں بلکہ ہمارے اردگرد کے جیتے جاگتے انسان کی کیفیات ہیں اس لیے ہر شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اپنا حال بیان کیا گیا ہے۔ فراز کی شاعری کی یہی خصوصیّت ہے جس نی اسے ایک ہر دلعزیز شاعر بنا دیا۔ اس کی عزت اور شہرت میں اگر کوئی کمی باقی تھی تو وہ ضیاء الحق کے دور آمریت میں ''پیشہ ور قاتلوں'' جیسی نظم لکھنے پر اس کی گرفتاری اور حراست نے پوری کر دی۔ محبت کا شاعر تو وہ تھا ہی اس کا مزاحمتی اور باغیانہ روپ بھی ابھر کر سامنے آ گیا۔ عوام کے دلوں میں اس کی محبت اور اس کا احترام پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گیا۔ انہی دنوں اقبال بانو کی دل میں اتر جانے والی آواز گونجی:

نہ حریف جاں نہ شریکِ غم' شب انتظار کوئی تو ہو
کسے بزم شوق میں لائیں ہم دل بے قرار کوئی تو ہو

جہاں تک شاعر کی حیثیت سے احمد فراز کا تعلق ہے وہ بلا شبہ ایک نہایت مشاق اور منجھا ہوا شاعر ہے۔ الفاظ کے مزاج سے جتنا وہ واقف ہے شاید ہی اس کے ہم عصروں میں کوئی اور ہو۔ الفاظ کے استعمال میں اس نے اسی فنی شعور کا مظاہرہ کیا جس کا معیار میر تقی

میر' امیر خسرو' آتش اور داغ نے قائم کیا تھا مگر اسے قارئین اور سامعین کی سہولت کیلئے اس نے اس بات کا بطور خاص خیال رکھا ہے کہ کوئی نامانوس ادق اور گنجلک لفظ اس کے اشعار میں نہ آنے پائے۔ مزاحمتی شاعری میں وہ خیالات وتصورات کی حد تک فیض احمد فیض کا پیروکار بلکہ خوشہ چین ہے مگر اس کا اسلوب بیاں نہایت سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ اسے یار لوگ ''فیض میڈ ایزی'' بھی کہا کرتے تھے۔ اس کی عشقیہ اور محبت کی شاعری فیض کی شاعری سے مختلف ہے وہ اپنی محبوبہ سے یہ نہیں کہتا:

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

وہ کسی افلاطونی محبت کا قائل نہیں' نہ ہی اس سلسلے میں اس میں کوئی وفاداری بشرط استواری ہے۔ محبت کے معاملات میں اس کی شاعری میں بھی عاشق کا وہی کردار ابھرتا ہے جس کا بیان فارغ بخاری نے کیا ہے۔

اس کی محبوبہ اختر شیرانی کی محبوبہ کی طرح کسی خیالی دنیا کی باسی نہیں۔ غالب اور داغ کی طرح وہ کسی ایسی محبوبہ کا ذکر بھی نہیں کرتا جو کوٹھے پر بیٹھنے والی ہو۔ اس کی محبوبائیں تو ہمارے اردگرد کے ماحول کی جیتی جاگتی عورتیں ہیں جو روزمرہ کی ملاقاتوں اور میل جول میں اس کے احساس جمال کو تسکین پہنچاتی ہیں۔ کسی گہری محبت یا ایفائے عہد یا پاس وفا کا نہ وہ خود قائل ہے نہ اس کی محبوبائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے روایتی معنوں میں کسی سے محبت کی ہی نہیں۔ اردو کے کسی اور معروف شاعر نے اس طرح کے خیالات کا اظہار نہیں کیا جن کا بیان فراز کے مندرجہ ذیل قسم کے اشعار میں ملتا ہے:

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے
دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جان فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

اس کے ہمراہ چلے ہم تو فضا اور لگی
راستے اور لگے لغزش پا اور لگی
ہر نیا عشق نیا ذائقہ رکھتا ہے فراز
آج کل پھر تری غزلوں کی ادا اور لگی

رہا ہے کون کس کے ساتھ انجام سفر تک
یہ آغاز مسافت سے ہی ہم تم جانتے تھے
مزاجوں میں اتر جاتی ہے تبدیلی مری جاں
سو رہ سکتے تھے کیسے ہم بہم تم جانتے تھے

یہ اشعار کسی گہری محبت یا کسی جذبۂ عشق کے غماز نہیں ہیں مگر جہاں تک ایک عام آدمی کی روزمرہ زندگی کا تعلق ہے یہ اشعار حقیقت کے زیادہ قریب ہیں۔ آج کے دور میں باقی شعبہ ہائے زندگی کی طرح شاعری میں بھی لوگ زمینی حقائق کا اظہار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ فراز کی شہرت اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

اب اس سوال کا ذکر بھی ہو جانا چاہئے جو ظفر اقبال نے فراز کے بارے میں اپنے مضمون ''ملک سخن کا شہزادہ'' میں اٹھایا ہے۔ ظفر اقبال نے لکھا ہے:

''میں نے ایک مشاعرے کے دوران اس سے کہا کہ فراز جس طرح کی شاعری تم کرتے ہو' کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہارے مرنے کے بعد یہ زندہ رہے گی۔ وہ بولا ''ظفر اقبال! جتنی عزت لوگوں کی محبت اور شہرت مجھے مل گئی ہے' وہ میرے لئے کافی ہے اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میری شاعری میرے مرنے کے بعد زندہ رہتی ہے یا نہیں''۔

اسی طرح کے خیالات کا اظہار اس نے ایک دفعہ میرے سامنے بھی کیا تھا بلکہ کہا تھا:

''غالب نے مرنے کے بعد جتنی شہرت پائی ہے' اس سے کہیں زیادہ مجھے جیتے جی مل گئی ہے''۔ اس کے جواب میں' میں نے اسے یہ کہا تھا کہ جیتے جی تو ذوق کو بھی غالب سے زیادہ شہرت ملی تھی۔

مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ احمد فراز بے حد مشہور اور مقبول شاعر تھا بلکہ شعروسخن سے مس رکھنے والے خواتین و حضرات اور بالخصوص نوجوان نسل کا محبوب شاعر تھا مگر وہ بڑا شاعر نہیں تھا۔ اس کا نام ہم میر' سودا' غالب' مصحفی' آتش' حالی' اقبال اور فیض کے ساتھ نہیں لے سکتے۔ اردو کے کئی نسبتاً کم معروف شاعر اس سے کہیں بہتر شاعر ہیں مثلاً فانی' جلیل مانک پوری' باقی صدیقی' سراج الدین ظفر اور کئی دوسرے شعرا مثلاً ناصر کاظمی' شکیب جلالی' عبدالحمید عدم بھی اس سے بڑے شاعر ہیں۔

احمد فراز کے آخری مجموعے ''عشق جنوں پیشہ'' میں احمد فراز کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے لکھا ہے۔

''احمد فراز کی شاعری کے گرد سب سے زیادہ دھند اُن کی بے حساب شہرت اور مقبولیت نے پھیلائی ہے.....' فراز کی عام مقبولیت اور بے حساب شہرت نے ان کی شاعری پر سنجیدہ سوچ بچار کے راستے میں خاصی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ غیر معمولی شہرت اور بے تحاشا مقبولیت ان کی شاعری کا حجاب بن کر رہ گئی ہیں''۔

شعروسخن کا ذوق تسلیم رکھنے والے جانتے ہیں کہ فراز کے ڈھیر سارے کلام میں ایسے اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں' جنہیں بار بار پڑھنے اور گنگنانے کو جی چاہے۔ جو تنہائی میں آپ کے مونس بنیں۔ جو آپ کی شخصیت میں رچ بس جائیں۔ آپ کے لاشعور اور آپ کی شخصیت کا حصہ بن جائیں۔

فراز نے اچھے شعر کہے ہیں مگر ان شعروں کا شمار آپ زندہ اور لافانی اشعار میں نہیں کر سکتے۔ فراز کے ہاں اس طرح کے اشعار نہیں ملتے مثلاً

زندگی حرف غلط ہی نکلی
ہم نے معنی تو بہت پہنائے ہم نے

حادثات جہاں نے راہ نہ دی
آپ کا نام بھی لیا ہم نے
خونِ دل سے درِ میخانہ پر
تیری تصویر بنا دی ہم نے
(باقی صدیقی)

سایۂ قصر یار میں بیٹھا
میں تھا اپنے خمار میں بیٹھا
اس کا آنا تھا کہ خواب میں آنا
میں عبث انتظار میں بیٹھا
کوئی صورت نہیں ہے اس جیسی
اس کو دیکھو ہزار میں بیٹھا
(منیر نیازی)

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
میں ڈر رہا ہوں تمہاری نشیلی آنکھوں سے
کہ لوٹ لیں نہ کسی روز کچھ پلا کے مجھے
دکان مے پہ پہنچ کر کھلی حقیقت حال
حیات بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا
قاصد پیام شوق کو دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں
(جلیل مانک پوری)

بہاروں کو چمن یاد آ گیا ہے
مجھے وہ گل بدن یاد آ گیا ہے
لچکتی شاخ نے جب سر اٹھایا
کسی کا بانکپن یاد آ گیا ہے
کسی کا خوبصورت شعر سن کر
ترا لطفِ سخن یاد آ گیا ہے
آج کی رات پھر نہیں ہوگی
یہ ملاقات پھر نہیں ہوگی
اک نظر مڑ کے دیکھنے والے
کیا یہ خیرات پھر نہیں ہوگی
(رفعت سلطان)

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم
نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں
مرے تو دل میں اتر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر
وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا
پھر نہ جانے کدھر گیا وہ
کچھ یادگار شہر ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
اس شہر بے چراغ میں جیا گئی تو کہاں
آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں
(ناصر کاظمی)

اس طرح کے سینکڑوں شعروں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے جو احمد فراز نہیں کہہ سکتا تھا۔ ناصر کاظمی کا یہ مصرع تو فراز کے تصور میں ہی نہیں آ سکتا۔ اس نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ وہ شب فراق کو کبھی گھر لے کر نہیں گیا۔ وہ ہمیشہ شب وصل کو ساتھ لے کر گیا ہے۔ کسی ایک محبوبہ کے ساتھ نہیں نئی نئی محبوباؤں کے ساتھ۔

ظفر اقبال نے اپنے مضمون ''ملک سخن کا شہزادہ'' میں ایک اور بات بھی لکھی ہے جو قابل ذکر ہے۔

''ہم دونوں میں دوستی بھی تھی اور اکثر اوقات چونچ بازی بھی ہوتی رہتی۔ میں اسے طلبا و طالبات، نرسوں، استانیوں اور بیوروکریٹس کا شاعر کہتا، وہ میری شاعری کو لفظوں کی اچھل کود سے تعبیر کرتا''

میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کافی حد تک دونوں کی بات صحیح ہے۔

نجیب احمد کی یاد میں

(ممتاز شاعر نجیب احمد گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے ان کی یاد میں لکھی گئی)

جہانِ فانی سے کیا گئے ہیں نجیب احمد
عزیز سب کو رُلا گئے ہیں نجیب احمد

وہ دوست ایسے تھے دوستوں کو عمل سے اپنے
ہے دوستی کیا بتا گئے ہیں نجیب احمد

دیارِ شعر و سخن میں جلتے رہیں گے برسوں
چراغ جتنے جلا گئے ہیں نجیب احمد

اُسی پہ چلتے رہیں گے عشاق دیر تک اب
جو راستہ بھی بنا گئے ہیں نجیب احمد

انہیں بتا کر گئے تھے خالد جو شاعری میں
وہ راز ہستی کا پا گئے ہیں نجیب احمد

وہ جام جس میں محبتیں ہی محبتیں تھیں
وہ جام سب کو پلا گئے ہیں نجیب احمد

غزل کو کیسے غزل بنانا ہے شاعروں کو
غزل سنا کر سکھا گئے ہیں نجیب احمد

وہ آئے تھے جب یہاں پہ محدود گھر تھے لیکن
سخن کی بستی بسا گئے ہیں نجیب احمد

یقین آتا نہیں ہے جانے کا ان کے ہرگز
عزیز لگتا ہے آ گئے ہیں نجیب احمد

عزیر احمد/لاہور

شفیق سلیمی کی غزل

جلیل عالی/اسلام آباد

اردو غزل کے معتبر شاعر شفیق سلیمی گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ان کے بھائی نامور ادیب جلیل عالی کا یہ مضمون ارژنگ میں بطورِ خاص شائع کیا جا رہا ہے۔

....

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

شفیق سلیمی کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔ اس شعر نے اسے جہاں بہت جلد قارئین و سامعین کے ایک وسیع حلقے میں متعارف کروا دیا وہاں خرابی یہ ہوئی کہ اس کی شاعری پر مہاجرت کی چھاپ لگ گئی عام قاری تو ایک طرف اس کی شاعری پر تحریری اظہار خیال کرنے والے قلمکاروں نے بھی بیشتر اسی حوالے کو سامنے رکھا۔ بے شک شفیق سلیمی نے ایک طویل عرصہ بہ سلسلہ ملازمت بیرونِ وطن گزارا، مگر اس کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو باہر رہ کر بھی اردو شاعر و ادب کے مرکزی دھارے سے بے تعلق نہیں رہے۔ ایسے شعرا نے پاکستان سے شائع ہونے والے شوقیہ ادبی پرچوں کے ذریعے تازہ تر تخلیقی رویوں سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا۔ خصوصاً ہماری زندہ شعری روایت کے فروغ کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے زیرادارت شائع ہونے والا ادبی جریدے ''فنون'' کا کردار بڑی اہمیّت رکھتا ہے۔ ''فنون'' نے ایک مدت تک بڑے تسلسل کے ساتھ اندرون ملک اور بیرون ملک شعرا کو ایک دوسرے کے شعری تجربات میں شرکت کی سہولت فراہم کی۔ ''تمازت کی اشاعت سے بیشتر شفیق سلیمی کا کلام بھی زیادہ تر فنون'' کے ذریعے ہی قارئین تک پہنچا۔

زندگی کا ایک بے حد اہم حصّہ اپنے اہل خانہ اور اہل وطن سے دور اجنبی سرزمین پر بسر کرنے کے دوران شفیق سلیمی جن تجربات و مشاہدات سے گزرا اس کی شاعری میں ان کا انعکاس ایک فطری بات ہے مگر اس نے ان تجربات و مشاہدات کو اپنے خاص انداز اور مختلف زاویے سے یوں بیان کیا ہے کہ ان پر عمومیت کے تناظر کو غالب نہیں آنے دیا۔

جو میرے ساتھ پہنچا منزلوں تک کون ہے وہ
جسے میں چھوڑ آیا راستوں میں کون تھا وہ

مدت کے بعد آئے تو روٹھی ہوئی سی تھی
تختی ہمارے نام کی در پر لگی ہوئی

دُوریاں کچھ اور بھی نزدیک لے آئیں اسے
قربتوں میں بھی مجھے جو فاصلہ دیتا رہا

پہچان کا ہر منظر ایمان ہوا آخر
لگتا ہے کہ صدیاں اک غار میں سو آئے

ابھی وطن سے دوری کے باوجود مرکزی تخلیقی دھارے سے ہم رشتہ رہنے کی بات کی گئی تھی۔ شفیق سلیمی کے ہاں کثرت سے ایسے اشارے ملتے ہیں جو وطن کے شب و روز سے اس کے گہرے سروکار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہندوستان کے سفر میں وطن عزیز جن جن بحرانوں سے گزرا، سیاسی و معاشی اعتبار سے اس میں جو اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان سب کا احوال بیان ہے اس کے ہاں جس شدت احساس کے ساتھ شعر ہوا ہے اس سے یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ وہ وطن سے باہر زیست کر رہا ہے آمریت کا عذاب ہو، قیادت کا بانجھ ہو، معاشی و معاشرتی تفاوت سے جنم لینے والے الیے ہوں کے قومی سلامتی و بقاء کا سوال۔ ہر ہر حوالے سے اس کے اشعار میں اس کے دل عمل اور فکرمندی کے نقوش نمایاں ہوئے ہیں۔ چند مثالیں۔

ہاتھوں میں بجھا چراغ لیکر
اندھا ہمیں راستہ دکھا رہا ہے

ساعت قید میں ہے لفظ گونگے ہو گئے ہیں
یہ کس نے ہر صدا کو بے صدا رکھا ہوا ہے

اک ذرا سورج کو اس کے سر سے ڈھل جانے تو دو
ساکنانِ شہر کو پھر اس کے شر میں دیکھنا

مجھ تک نہ پہنچ پائیں کرنیں کسی سورج کی
ان اونچے مکانوں نے یوں گھر میرا گھیرا ہے

زمیں تو خیر زمین تھی کہ تنگ ہم پر ہوئی
اک آسمان تھا وہ بھی سروں سے جاتا رہا

یہ اور ایسے بہت سے اشعار احساس دلاتے ہیں کہ شفیق سلیمی کی شاعری کی تفہیم کو صرف رزق کی تلاش میں نکلے ہوئے شخص کے ذاتی دکھوں کی روداد تک محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ دروں بین شاعر نہیں ہے وہ ایک بیدار ذہن رکھنے والا شاعر ہے۔ اس کا دل درد مند کا نہ صرف وطن عزیز اور اہل وطن کے احوال سے متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ پوری انسانیت کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہے۔ وہ انسان کے عصری مسائل سے نا آگاہ نہیں ہے عالمی سامراج کی چیرہ دستیاں بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ کثیر قومی کمپنیوں نے زیادہ سے زیادہ منافع کے تعاقب میں جس طرح مارکیٹ اکانومی کے جن کو کھلا چھوڑ رکھا ہے اور کمزور قوموں اور ان کی تہذیبوں کی تباہی کو گلوبلائزیشن کا جو خوبصورت نام دے رکھا ہے۔ شفیق سلیمی نے بعض اشعار میں اس سارے عمل کو اپنے اندر کی بصیرت سے یوں گرفت میں لیا اور اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ان میں سچ ثابت ہو جانے والی پیش گوئیوں کی سی شان پیدا ہو گئی۔

پیکٹوں میں بند ہو کر اب ملے گی روشنی
بوتلوں سے شہر کو تازہ ہوا دی جائے گی

آنے والے وقتوں کے بے لحاظ موسم نے
سبز سبز شاخوں کو چوب دار کرنا ہے

پھول تو میرے ہی آنگن میں کھلیں گے پر شفیق
ان کی خوشبو دوسروں کے گھر بسا دی جائے گی

شفیق سلیمی کی شاعری زمینی شاعری ہے۔اس میں آسمانی حوالے کم کم آئے ہیں۔ زندگی نے اسے حقیقت کی مابعد طبعیاتی جہتوں کی طرف نکلنے کی فرصت ہی نہیں دی۔ اگرچہ اسے اس کا احساس ضروری ہے کہ

شب کی بستی کے کچھ دریچے
کھلتے ہیں ساتویں طرف میں

گر اسے گرد و پیش گزرتی ہوئی زندگی کے ٹھوس حقائق بھی ایسے گھمبیر دکھائی دیتے ہیں کہ ان کی تہوں تک نفرت کا سفر مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کے وجودیاتی تجسس اور نفسیاتی شعور نے زندگی کے عام احوال کے پس پردہ ایسے ایسے پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں کہ معمول میں موجود غیر معمولی عنصر کی نشاندہی سے حیرت واستعجاب کے در وا ہونے لگتے ہیں۔

یوں تو مجھے بھی تو نظر آتا ہے مطمئن
بیٹھا ہے تیرے دل میں جو اس ڈر کی بات کر
ایک خواہش کے ہزاروں رنگ، عمر مختصر
کچھ بھی کر پاتا نہیں میں اس قدر عجلت میں ہوں
وہ آنکھ کھلنے کا بھی انتظار کرتا نہیں
درونِ خواب ہی تعبیر خواب اس کی طلب
پھر اندھیرے میں بھی آنکھیں دیکھنے لگ جائیں گی
جب دیئے کی ٹمٹماتی لو بجھا دی جائے گی

جہاں تک شفیق سلیمی کے طرزِ اظہار کا تعلق ہے، میرے نزدیک اس کو اہم ترین اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حکیم مومن خان مومن کی طرح شعر میں کوئی نہ کوئی گرہ رکھ دیتا ہے۔ جس سے اس کے مفہوم تک پہنچنے کے لئے قاری کو ذرا غور کرنا پڑتا ہے اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعری جتنی سادہ دکھائی دیتی ہے اتنی سادہ ہے نہیں۔ چنانچہ جب پڑھنے والے پر اصل بات کھلتی ہے تو وہ ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوتا ہے۔ شفیق سلیمی کی شاعری کی تخلیقی و جمالیاتی قدر و قیمت میں اس اخفائی کا عنصر بہت اہم حصہ ہے۔

شفیق وہ تو بنا ہے عجیب مٹی سے
کہ دے کے دستکیں سنگ صدا بھی ٹوٹ گیا
پھینکنا لفظوں کے کنکر خامشی کی جھیل میں
اور پھر بنتے بگڑتے دائروں کو دیکھنا
دشمنوں سے بھی تعلق دوستوں کے ساتھ ساتھ
دھوپ بھی نکلی ہوئی ہے بارشوں کے ساتھ ساتھ

ایک سچے فنکار کے لئے نارسائی اور عدم تکمیل کا احساس بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر ہی اسے زندہ اور تازہ دم رکھتا ہے۔ شفیق سلیمی یقیناً خوش قسمت ہے کہ اسے یہ نعمت میسر ہے۔ شفیق سلیمی نے اس احساس واعتراف کو بھی اپنے بیان کے امتیازی وصف سے خوبصورت بنا دیا ہے۔

جذبے کہاں صدا ہوئے لفظ ہی بس ادا ہوئے
کون تھے جو اسیر تھے کون ہیں جو رہا ہوئے

اساتذہ کے ہاں فنی باریکیوں اور چابکدستیوں کے مظاہروں کی بے شمار صورتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک صورت شعر میں اندرونی قوافی کے استعمال ہیں۔ اور اگر بحر دو یا دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم ہو رہی ہو تو ہر حصے کے ساتھ ہر کافی آنے سے صوتی حسن میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے عہد میں خالد احمد کے ہاں اس کے نمونے سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ شفیق سلیمی کو بھی یہ طریقہ کار بہت مرغوب ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں ایسا کرنے کا موقع ملتا ہے وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہ تمام اگر التزام وتکلف کا تاثر نہ ابھارے تو آہنگ بیان کو دل آویز بنا دیتا ہے۔ چند خوبصورت مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

تو کس شمار میں آئے گا کہ کس خمار میں ہے
زمین دھند میں لپٹی فلک ابھار میں ہے
تو ہین انا بھی کی تحسینِ ریا بھی کی
یہ بوجھ ڈھونا تھا یہ بوجھ بھی ڈھو آئے
لہر لہر بکھری ہے قہر قہر دریا میں
بے جواز لگتا ہے سعی رائیگاں رکھنا
ہجر کدے میں رات کیا یاد کا اک در کھلا
لائے تھے آشنا مہک جھونکے کبھی دیار کے

شفیق سلیمی کی ایک اور فنی خصوصیت بحروں کا تنوع ہے۔ ہمارے ہاں ایسے شاعر بھی موجود ہیں جن کے پورے پورے مجموعے ایک ہی بحر میں کہی ہوئی غزلوں پر مشتمل ہیں۔ یہ تو ہوگئی ذہنی جمود اور یکسانیت کی انتہائی مثال۔ بعض اچھے بھلے شاعر بھی چار پانچ رواں بحروں سے آگے نہیں بڑھتے۔ شفیق سلیمی نے اپنے تخلیقی تحرک کے باعث عام بحروں کے ساتھ ساتھ اظہار کے لئے بہت سی ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جو اکثر شاعر کم کم ہی استعمال میں لاتے ہیں مثلاً:

سرِ راہِ شفیق اک حادثہ رکھا ہوا ہے
دیکھا تو سمندر تھا پرکھا ہے تو صحرا ہے
رات مدہوش تھی اور سمندر کے پہلو میں مہتاب تھا
سر میں ایک سودا تھا بام و در بنانے کا
دلوں میں عذابوں کے ڈر ہیں یہ کن موسموں کے
اب جا کر احساس ہوا ہے پیار بھی کرنا تھا
منظروں کو دیکھنا پس منظروں کو دیکھنا
گر اک بھی اشک بہاؤں

اچھی شاعری شاعر کی تخلیقی اُپج اور اس کے تنقیدی شعور کے باہمی تعامل اور توازن سے وجود میں آتی ہے۔ اگر شاعر کے اندر کا نقاد اس کی تخلیقی ذات سے بڑا ہو تو شعری نمو رک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اگر اندر کا نقاد کم عیار ہو تو اچھے بڑے کی تمیز نہ ہونے کے باعث رطب و یابس کے انبار لگ جاتے ہیں۔ اگر شاعر کو اس بات کا علم ہو کہ اس کے تخلیقی جوہر کا اصل کمال کہاں کہاں سامنے آیا ہے تو اشعار کی تراش خراش میں اس سے بہت مدد ملتی ہے اور شاعری کے مجموعی معیار پر بڑے مثبت الرات مرتب ہوئے ہیں۔ شفیق سلیمی جانتا ہے کہ اس کا تخلیقی جوہر خود اس کے لئے کہاں ایک چیلنج کی صورت حال ابھارتا ہے۔

وہ بات جو کہ باعث شہرت ہوئی تجھے
اب کم سے کم تو اس کے برابر کی بات کر

ایسے شعور سے بہرہ ور شاعر کی کمزور شاعری بھی ایک خاص فنی سطح سے نیچے نہیں اُترتی۔

میں اور مجلس ترقی ادب

منصور آفاق/لاہور

مجلس ترقی ادب کے قیام کے پانچ مقاصد اس کے آئین میں بیان کئے گئے ہیں (1) کلاسیکی ادب شائع کرنے کا مناسب اہتمام ۔ (2) ادب عالیہ کی تشکیل میں معاونت (3) ادب عالیہ کے تراجم ۔ (غیر ملکی زبانوں سے اُردو میں اور اردو سے غیر ملکی زبانوں میں)۔ (4) ہر سال بہترین ادبی مطبوعات کے مصنفین کو انعام ۔ (5) سال کے بہترین مضامین اور منظومات پر انعام ۔لیکن انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ماضی میں مجلس سے وہ کام نہیں لیا گیا جس کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کلاسیکی ادب شائع کیا گیا مگر ایک عجیب و غریب مذاق کے ساتھ ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب کے ساتھ چھ سات سو صفحات کا دیباچہ شامل کر لیا گیا۔ جو دوسرا مقصد تھا۔ ادب عالیہ کی تشکیل میں معاون ۔ اس پر کسی نے کام ہی نہیں کیا۔ تیسرا مقصد تھا، ادب عالیہ کے تراجم ۔ اس میں ستر فیصد ایسی کتابیں شامل ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں، چوتھا اور پانچواں مقصد تھا۔ اچھے ادب کی تخلیق پر انعام دینا۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصہ سے رکا ہوا ہے۔ میں جب دفتر میں داخل ہوا تو تو بھوت بنگلے کا تصور ذہن میں آیا جسے روشنی، ہوا اور خوشبو سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس ادارے نے پانچ سو کتابیں چھاپ رکھی تھیں مگر کہیں اور تو کجا دفتر میں بھی کوئی ڈسپلے سنٹر نہیں تھا اسٹورز میں ایک لاکھ پچیس ہزار کتابیں بند پڑی تھیں، گراؤنڈ فلور کی اتنی بری حالت تھی کہ ڈائریکٹر سمیت کسی کمرے میں کسی کا بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مجھے سانس لینا مشکل لگا۔ پہلے فلور پر گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پتہ چلا برس ہا برس سے تالا لگا ہوا ہے اس میں صرف ٹوٹی پھوٹی چیزیں پڑی ہیں۔ اوپر والے فلور میں لائبریری تھی۔ پتہ چلا کہ یہ لائبریری بھی پچھلے آٹھ سال سے بند پڑی ہے اور مجلس کے ملازمین اس لائبریری کو دفتر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سو نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔ پہلے گراؤنڈ فلور پر توجہ دی۔ ڈسپلے سنٹر کے لئے جگہ نکالی۔ دیواریں مرمت کرائیں فرش درست کرائے۔ رنگ روغن کرایا۔ اسے اس قابل بنایا کہ کوئی یہاں آ کر کچھ دیر بیٹھ سکے۔ فرسٹ فلور کو دفاتر میں تبدیل کیا۔ ملازمین کو بیٹھنے کی جگہ فراہم کی۔ یعنی لائبریری سے کچھ لوگ فرسٹ فلور پر منتقل کئے، کچھ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ اسٹور میں بنائی۔ نوکری طے صرف ایک آدمی کو نکالا جو ساٹھ ہزار کے قریب تنخواہ لیتا تھا اور پچھلے پانچ سال سے کبھی دفتر نہیں آیا تھا۔ بیس کتابیں پرنٹنگ پریس بھجوائیں، یہ وہ کتابیں تھیں جن کی مارکیٹ میں ضرورت تھی لیکن یہ ہمارے پاس ختم ہو چکی تھیں۔ ای بک کی تیاری شروع کرائی۔ اس ای بک ٹیبلٹ میں دس ہزار کتابیں شامل ہونگی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ ایم او یو کیا جس میں بین الاقوامی ترقی ادب کانفرنس کا انعقاد شامل ہے۔ پچاس لاکھ روپے پنجاب یونیورسٹی نے اس کے لئے مختص کئے ۔ صدر پاکستان ڈاکٹر عارف علوی سے ملاقات کی۔ انہوں نے کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا۔ ان شاءاللہ کورونا کے ختم ہوتے ہی اس کانفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔ اسی کانفرنس میں رائٹرز کو اس سال کے ایوارڈ بھی دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی میں جو چوبیس ہزار کلاسیکی کتابوں کے قلمی نسخے پڑے ہیں۔ یونیورسٹی وہ ہمیں فراہم کرے گی اور ہم ان کی اشاعت کا بندوبست کریں گے۔ اگلے ہفتے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے بھی ایک ایم او یو پر دستخط کئے جانے ہیں۔ جی سی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اصغر زیدی خود مجلس کے دفتر میں آئے اور انہوں نے مجلس کے ساتھ مل کر ترقی ادب کے لئے کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک اور کام شروع کرایا کہ کتاب کی اشاعت پر تو ہم خرچ کرتے ہیں مگر اس کی پبلسٹی پر ایک روپیہ بھی نہیں لگاتے ۔ یوٹیوب کے لئے کتابوں پر تبصروں کے ویڈیوز بنوانے شروع کئے ہیں۔ ایک معیاری ویب سائٹ بنوائی ہے۔ جہاں مجلس کی کتابیں فروخت ہونگی۔ مجلس کے لائبریری کی الماریوں میں پڑے ہوئے بے شمار قلمی نسخوں اور مسودات کو چوہے کھا چکے تھے۔ دیمک چاٹ چکی تھی۔ ان کے لئے دو مخطوطہ شناس پروفیسر باقر علی شاہ اور پروفیسر شفیق احمد خان کو باقاعدہ ہائر کیا۔ وہ تقریباً پندرہ دن سے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بے شمار قیمتی چیزیں ضائع ہو چکی ہیں مگر بہت کچھ بچانے میں ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں لائبریری کی کتابوں کو محفوظ بنانے کے لئے اس کے اردگرد شیشے لگوانے کا کام بہت ضروری ہے۔ یہاں ایک فیومی گیشن مشین بھی ہے جس سے گزارنے کے بعد کتابیں دوسو سال کے لئے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ وہ مشین عرصہ دراز سے خراب پڑی تھی۔ اسے مرمت کرایا اور کتابوں کی فیومی گیشن شروع کرائی۔ یہاں پچھلے ستر سالوں میں جو پانچ سو کتابیں چھاپی گئی ہیں ان میں شاید ایک بھی رائٹر ایسا نہیں جس کا تعلق جنوبی پنجاب سے ہو۔ اس لئے میں نے درخواست دی ہے کہ ہمیں جنوبی پنجاب میں مجلس ترقی ادب کی ایک شاخ بنانے پر کام شروع کرنا چاہئے۔ اس سال یونیسکو کی طرف سے لاہور کو سٹی آف لٹریچر کا اعزاز ملا ہے۔ مجلس کے قیام کے دوسرے اہم ترین مقصد ''ادب عالیہ کی تشکیل یعنی تیاری میں معاونت'' کو سامنے رکھتے ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ادیبوں شاعروں کے مل بیٹھنے کے لئے، ادبی موضوعات پر گفت و شنید کرنے کیلئے ایک ادبی چائے خانہ بنایا جائے۔ جو بہت آرٹسٹک ہو۔ اس سلسلے میں سید بلال حیدر، جو سوشل سکیورٹی پنجاب کے کمشنر ہیں، نے بہت ساتھ دیا۔ اس کے چلانے کے لئے ڈاکٹر امجد ثاقب نے اخوت کی طرف سے فنڈنگ فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ سیالکوٹ چیمبر آف کامرس کے چیئرمین قیصر بریار نے ایوارڈ کیلئے اپنے گروپ کی طرف سے دس لاکھ روپیہ سالانہ فراہمی کا وعدہ کیا۔ گوگرین ویلفیئر سوسائٹی کی صدر عاصمہ فرہاد بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہیں۔ ڈیزائننگ میں الحمرا آرٹس کونسل سے ماہ رخ نوید نے ہمارے لئے بہت کام کیا۔ وزیر جنگلات سبطین خان بھی آئے۔ انہوں نے ادبی چائے خانہ میں بڑی دلچسپی لی ۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے بھی دفتر کا وزٹ کیا۔ وفاقی وزیر اطلاعات فواد چودھری نے جیل خانہ جات میں لائبریریز بنانے کے لئے ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا۔ پنجاب کے وزیر ثقافت میاں خیال احمد کاسترو نے 22 ملین روپے کے ایک پروجیکٹ کی منظوری دی۔ ان تمام معاملات کا کریڈٹ وزیر اعلیٰ عثمان بزدار کو نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ بہر حال مخیّر حضرات سے اس سلسلے میں مزید معاونت کی درخواست ہے۔

''میزانِ فکر'' (پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا مجموعہ رباعیات)

نسیم سحر/راول پنڈی

سینئیر اور قادر الکلام شاعر پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا ۲۰۲۰ء کے اواخر میں شائع ہونے والا مجموعہ ''میزانِ فکر'' ایک ایسی صنف یعنی رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں آج کے شعراء نے مشکل سمجھ کر بہت کم سخنوری کی ہے اور جو کسی حد تک نسلِ نو کی عدم توجہی کے سبب متروک کہی جا سکتی ہے۔ مگر پروفیسر حسن عسکری کاظمی جیسے ہمہ جہت تخلیق کار، شاعر، نقاد اور ماہرِ عروض کے نزدیک تو یہ گویا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انہوں نے رباعی نگاری کسی قدر تاخیر کے ساتھ شروع کی مگر جب لکھی تو پھر اس نسبتاً مشکل صنفِ سخن کو بھی مالا مال کر دیا۔ جس کے نتیجے میں معیاری رباعیات کا یہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل مجموعہ شائع ہوا ہے۔

اس مجموعے پر ناشر کا کوئی نام درج نہیں ہے جبکہ کتاب کے حصول کے لیے بھی خود پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا ہی پتہ درج ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ اُنہوں نے خود ہی یہ کتاب شائع کروائی ہوگی۔ اصل میں حالیہ دنوں میں بہت سے ناشرین جس انداز میں کتاب شائع کروانے والوں سے حد سے زیادہ پیسے طلب کرنے کے باوجود کتاب کے کاغذ اور چھپائی، جلد بندی وغیرہ میں ڈنڈی مار جاتے ہیں، اُس کے پیشِ نظر بہت سے ادیبوں شاعروں نے اپنے طور پر کتابیں شائع کروانا شروع کر دی ہیں۔ ناشر بھی کتاب شائع کرنے کے بعد اس کی فروخت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، تو بہتر تو یہی ہے کہ کتاب خود ہی شائع کی جائے اور خود ہی تقسیم کی جائے۔

بہر حال یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ ''میزانِ فکر'' کا عنوان ہی کتاب کے فکری و تخلیقی انداز کی ترجمانی کرتا ہے کہ فکر اور وہ بھی میزان پر تُلی ہوئی۔ ابتدائی صفحات پر ہی انہوں نے رباعی کے بارے میں موجودہ رویّوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک رباعی میں کس سلیقے کے ساتھ کہا ہے:

اندازِ بیاں تُم جو ہمارا چاہو
ہر گز نہ کبھی ہم سے کنارا چاہو
مشکل تو نہیں ایسی رباعی کہنا
اِس صنفِ سخن کو بھی خدارا چاہو

جناب حسن عسکری کاظمی نے بجا طور پر رباعیات کے اس مجموعے کا انتساب عظیم مرثیہ نگار میر ببر علی انیسؔ کے نام اس اعتراف کے ساتھ کیا ہے کہ ''۔۔۔ اُن سے بڑا رباعی نگار بھی کوئی نہیں''۔ جو لوگ مرثیے اور رباعی کے حوالے سے میر ببر علی انیسؔ کو جانتے ہیں وُہ اس سے سرِمو انکار کر ہی نہیں سکتے۔

حسن عسکری کاظمی کا پیش لفظ ''قاری سے مکالمہ'' بھی پڑھنے کی چیز ہے، اپنی درجِ بالا رباعی میں تو اُنہوں نے رباعی نگاری کو آسان ٹھہرایا ہے لیکن پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ ''رباعی نہایت مشکل اور سخت یا کٹر قسم کی چیز ہے، اسے وہی شاعر تخلیق کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے جسے اس کے اوزان کا حقیقی علم ہو، بحرِ ہزج کے مخصوص اوزان سے بہرہ ور شاعر ہی رباعی کہہ سکتا ہے''۔ پیش لفظ میں انہوں نے جوشؔ ملیح آبادی کا یہ اقتباس دے کر گویا اپنی رباعی نگاری کا جواز مہیا کیا ہے: ''رباعی کم بخت ایسی چیز ہے جو چالیس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شاعر کی زندگی میں رباعی نویسی کا دور آخر میں ہوتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ جناب حسن عسکری کاظمی کو عمرِ طویل دے کہ وہ ایسی ہی عمدہ اور رواں دواں رباعی نگاری کا تخلیقی سفر جاری رکھیں اور ہم عصر شاعری کو مالا مال کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ اور آنے والے ادیبوں کے لیے بھی ایک مثال چھوڑ جائیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے کتاب کے فلیپ میں کیا خوب لکھا ہے کہ: ''رباعی کی صنفِ دشوار اب تک اُن کی توجہ سے محروم تھی۔ سو اب دیر آید درست آید کے مصداق انہوں نے بڑی تعداد میں رباعیات کہہ ڈالی ہیں۔۔۔ موضوعات کا وہی تنوع جو اُن کی پہچان ہے، رباعیات میں بھی کارفرما ہے۔۔۔''

ڈاکٹر خورشید رضوی نے چند لفظوں میں حسن عسکری کاظمی کی رباعی نگاری پر جو کچھ کہا ہے اس کی صداقت کا اعتراف کتاب کی رباعیات پڑھ کر ہوتا ہے اور قاری متحیر رہ جاتا ہے کہ تنوع کے ساتھ ساتھ مصنف کی ہر نوع کے موضوعات پر اور رباعی کی بحر پر کیسی اُستادانہ اور مشاقانہ گرفت ہے۔ حسن عسکری کاظمی نے رباعی نگاری کے سفر میں عہدِ موجود کے ایک اور عمدہ اور سینئیر رباعی نگار جناب گلزار بخاری کی رباعی نگاری کی اور ان کی رہنمائی کا بھی بڑے ظرف کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت اُن سے بہتر رباعی نگار کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ بلاشبہ جناب حسن عسکری کاظمی کی یہ رائے مبنی بر حقیقت ہے۔

''میزانِ فکر'' انتہائی سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔ ہر صفحے پر دو رباعیاں درج ہیں اور ہر رباعی پر ''رباعی'' کا عنوان بھی دیا گیا ہے۔ حسن عسکری کی قادر الکلامی کا کسی حد تک اندازہ فہرست دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس میں

رباعیات کے الگ الگ عنوانات کے تحت حمدیہ، نعتیہ، منقبتیہ، رثائی، اخلاقی، ذاتی، سیاسی اور معاشرتی رباعیات دی گئی ہیں جن کی کل تعداد ۲۹۱ ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ رباعی نگاری کچھ اس قدر آسان بھی نہیں تو پھر ایک مختصر عرصے میں تخلیق ہونے والی رباعیوں کی یہ تعداد کچھ کم بھی نہیں۔ ان کی قادرالکلامی کی بات آئی ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ حسن عسکری کاظمی کی تا حال شائع شدہ نظم و نثر پر مشتمل کتب کی تعداد ۳۹ ہے جن میں حمد و ثنا، نعت، غزل، مناقب سلام تنقیدی مضامین، تبصرے، خاکے، قومی نظمیں، قطعات سفرنامہ، آپ بیتی، جائزے اور علمی وادبی کالم شامل ہیں۔ ماشاءاللہ اُن کا تخلیقی سفر اور ان کی کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ یہاں متنوع موضوعات کے ساتھ ان کی چند رباعیات ان کے فن کے اعتراف کے طور پر پیش کی جارہی ہیں:

ڈوبے نہ کبھی میرا سفینہ یا رب
بھولوں نہ محبت کا قرینہ یا رب
ہر گام پہ واجب ہوا سجدہ اس کا
مرکز ہے عقیدت کا، مدینہ یا رب

دنیا میں تو آقاؐ سا شہنشاہ نہیں
اُنؐ جیسی کسی کی کوئی بارگاہ نہیں
مہمان بنایا ہے سرِ عرشِ بریں
اُنؐ جیسا کسی کا حشم و جاہ نہیں

کیا کیا نہ محمدؐ نے سبھی کو بخشا
اک رتبۂ بے مثل علیؓ کو بخشا
اُس نور کے پیکر کو ولایت بخشی
جو کچھ بھی ملا، اپنے ولی کو بخشا

آیا کوئی کھونے، کوئی پانے کے لیے
آتے ہیں سبھی خاک میں جانے کے لیے
اب کوئی توازن بھی زمانے میں نہیں
ملتا ہے کہاں زہر بھی کھانے کے لیے

تعلیم سے وابستہ جو معیار ہوئے
ہم شعبۂ تحقیق سے بیزار ہوئے
اک خستہ و بوسیدہ عمارت دیکھی
کہنے کو بہت علم کے معمار ہوئے

دیکھا کہ زمانے کا عجب طور ہوا
کوفہ تھا جو صورت میں، وہ لاہور ہوا
آباد رہے ہم بھی ہمیشہ اس میں
یہ شہر تھا کچھ اور، مگر اور ہوا

ہم اہلِ قلم ہیں کہ ادارے ہم ہیں
ہم علم کا منبع ہیں، منارے ہم ہیں
رہتے ہیں کرائے کے مکاں میں اکثر
کہنے کو چمکتے ہوئے تارے ہم ہیں

بے مثل زمانے میں قیادت ہے تری
تاریخ میں مرقوم نصیحت ہے تری
اے قائدِ اعظم، تجھے بھولیں کیسے
مِلّت کو بہت آج ضرورت ہے تری

شاندار اور مخصوص اوزان پر پوری ہونے والی ان چند رباعیات کے ساتھ ہم یہ مضمون پروفیسر حسن عسکری کاظمی جیسے سینئر شاعر اور نقاد کی طویل اور لگاتار ادبی خدمات کے اعتراف اور تحسین کے طور پر اُنہی کی ایک رباعی کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

ہر لحظہ تخیل کی فراوانی ہے
قبضے میں مرے تختِ سلیمانی ہے
پرواز مری عرش بریں سے آگے
پہچان نہ پایا، تری نادانی ہے

حمد

جو حرف حرف میں عکسِ جمال تیرا ہے
تو اس میں میرا ہے کیا سب کمال تیرا ہے
جو میری سوچ کو رکھتا ہے تو سدا روشن
سو لفظ لفظ کے رُخ پر گلال تیرا ہے
میں مطمئن ہوں، اگرچہ وجود پر میرے
ہیں زخم دنیا کے، پر اندِمال رکھتا ہے
ہے موسموں میں یہ تہذیب اس لیے سائیں
جھلکتا ان میں بھی رنگِ جمال تیرا ہے
اگرچہ رہتا ہوں ہلکان کارِ دنیا میں
یہ جانتا ہوں کہ یہ دل نڈھال تیرا ہے
اِدھر اُدھر میں بھٹکتا پھروں ہزار مگر
شکستہ دل میں تو روشن خیال تیرا ہے

نعت

بھگو دے سوچ کو خوشبو سے جب ہوائے بہار
لکھوں جو نعت تو لفظوں کو خود سجائے بہار
میں تیرے شہر کی مٹی کو آنکھ سے چوموں
کبھی مجھے بھی تو اس طرح دن دکھائے بہار
ہر ایک لمحہ جہاں پر ہے رحمتوں کا نزول
وہ در ہمیشہ مہکتا رہے ورائے بہار
بس ایک لمحے کو پلکیں اُٹھی تھیں اُس کی طرف
تو کائنات نے اوڑھی تھی پھر ورائے بہار
اذیتیں ہوں وہ طائف کی یا کہ بطحا کی
مرے حضور نے سب کچھ سہا برائے بہار
جو اُس دیار سے گزری تو اُس پہ کیا گزری
کبھی تو کان میں چپکے سے یہ بتائے بہار
پھر اُس کے چہرے پہ رونق کو دیکھنا تم بھی
کبھی جو دل میں مری نعت گنگنائے بہار
نہ جانے حالت دل اس گھڑی ہو کیا ناصر
جب آپ نے در پہ بلائے مجھے خدائے بہار

ناصر علی سیّد/پشاور

مضمون

زرِداغ کا شاعر ولی عالم شاہین

سعدیہ سیٹھی / برطانیہ

گزشتہ دنوں کینیڈا میں مقیم سینئر شاعر ولی عالم شاہین کا شعری مجموعہ "زرِ داغ" حسن عباسی کی وساطت سے مجھ تک پہنچا اور میرے بھائی نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے متعلق اپنی رائے کالم کی صورت میں دیجیے۔ میری عادت ہے کہ میں ایک نشست میں کوئی بھی کتاب نہیں پڑھ سکتی بلکہ اُسے کئی قسطوں میں پڑھتی ہوں۔ جہاں مجھے کوئی نثر کا پیراگراف یا جملہ اچھا لگا یا کوئی شعر دل میں اُتر گیا میں نے کتاب چھوڑ دی، آنکھیں بند کر لیں اور دل کے دروازے کھول دیے اور اُس کا مکمل حظ اُٹھانے لگی شعر چاہے کسی موضوع پر ہو مگر اکثر اوقات اس کیفیت کے دوران بند آنکھوں سے کوئی خاموش آنسو گالوں پر تیرتا ہوا ہونٹوں پہ ٹھہر کر زبان میں جذب ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں قاری کا تخلیق کار کے ساتھ یہ جو آنسوؤں کا رشتہ ہے یہ دنیا کا سب سے سچا اور مضبوط بندھن ہے۔ کہاں لکھنے والا انجانے دیسوں اور دیاروں کا مقیم اور کہاں پڑھنے والا انجانے کون سی بستیوں کا باسی مگر صرف لفظ کی روح کی بنیاد پر وہ دونوں ایک آنسو میں ڈھل جاتے ہیں۔ ولی عالم شاہین کا شعری مجموعہ پڑھتے ہوئے بھی میں چند مقامات پر ایسی کیفیت سے گزری اور پھر کئی دن تک "زرِ داغ" میرے سرہانے پڑی رہی۔ میں گزشتہ شعری لذت، کیفیت اور حظ سے باہر آتی تو آگے بڑھ پاتی۔ کئی مقام پر تجربہ یکساں اور محسوسات شاعر کی شاعری کے ساتھ میل کھا گئے یعنی بقول غالب "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کتاب کے بیک ٹائٹل پر ولی عالم شاہین صاحب کی کتب اور ادبی سفر پر نظر ڈالی تو اپنی کوتاہ قامتی اور کم علمی کا احساس بڑھ گیا کہ ایک ادیب جس کی عمر ادبی دشت کی سیاحی میں گزری ہے مجھے آج تک اس کے بارے میں پتہ ہی نہیں لیکن اس متعلق میرا یہ ایمان بھی ہے کہ جو ملاقات کا وقت معین ہے جو تعارف کا لمحہ بنایا گیا ہے وہ اُسی لمحے میں ہونا ہے۔ زندگی میں ہزاروں ادیب ہوتے ہیں سب ایک دوسرے کو نہیں جانتے جو زیادہ تر کو جانتے ہیں تو لمحات مقرر ہیں "زرداغ" کی پہلی خوبی اُس کا قاری کو اپنی گرفت میں لینا ہے۔ شعری مجموعے بہت چھپتے ہیں بہت پڑھے جاتے ہیں مگر کتنے ہیں کہ آپ کو رُکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں آپ کو ایک تحریک اور فکر دے جاتے ہیں۔ "زرداغ" کا شمار بھی ان معدودے چند مجموعوں میں کیا جا سکتا ہے جو قاری میں اُتھل پتھل پیدا کرتے ہیں۔ فکری سطح پر اور قلبی سطح پر اس حوالے سے "زرداغ" کے بارے میں کہوں گی ولی عالم شاہین کے ہاں ایک مکمل جہاں آباد ہے۔ موضوعات کی سطح پر اور اہتمام والتزام تو ہے ہی خوب کہ فنی باریکیوں اور شعری رموز سے کماحقہ آگاہی رکھتے ہیں۔ ان کے فکری جہان سے لگتا ہے کہ خوب مطالعہ رکھتے ہیں۔ زندگی کا بھی خوب مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ لہٰذا یہ سب مل کر قاری کے لیے نئی فکر نئی سوچ کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ولی عالم شاہین قاری پر اپنا شعری نظریہ ٹھونستے نہیں نہ کہیں بلند آہنگ ہوتے ہیں نہ ہی ان کی شاعری میں کہیں شور کان میں پڑتا ہے۔ شعور ہے وہ بھی جنوں سے کیا ہوا اور اپنی سوچ ہے جس کو وہ غیر محسوس طریقے سے قاری کی روح میں اُتارتے ہیں جیسے کوئی روحانی سلسلہ ہو شاعری ہے ہی روحانی سلسلہ مگر اس کو چلانے کا سلیقہ بہت کم شعراء جانتے ہیں۔ ولی عالم شاہین اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کے مختلف رنگوں کی بہار ہے قاری اپنی مرضی اور اپنی پسند کا پھول چن سکتا ہے۔ کہیں بھی ان کی شاعری یکسانیت کا شکار نہیں ہے۔ بلکہ ہر غزل گزشتہ غزل سے نئے رنگ اور نئے ڈھنگ لیے ہوئے ہے۔ شعر کو شعر بنانے کے ہنر سے وہ بخوبی آشنا ہیں۔ لہٰذا میں تو یہ کہوں گی کہ "زرِ داغ" پڑھ کر نہ صرف میں نے حظ اُٹھایا بلکہ بہت کچھ سیکھا اور سمجھا اور کئی اشعار میری ڈائری کی زینت میں اضافہ کر گئے۔ ان میں سے چند ایک قارئین کی نذر بھی کرتی ہوں تاکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق بھی ہو جائے۔ آخر میں ولی عالم شاہین کو اس دیدہ زیب خوب صورت اور دلکش مجموعے کی اشاعت پر مبارک۔ دُعا ہے کہ ان کا شعری سفر یونہی جاری و ساری رہے۔

ملتا ہے تو بڑھ جاتی ہے جینے کی کشش اور
وہ شخص کہ تصویر سے باہر ہے زیادہ

کارِ جہاں کے مارے ہوؤں کی وحشت نے
عشق کی ہر اک مہلت کو برباد کیا

میری حیرت ہی زندگی ہے مری
ورنہ یکساں ہیں سارے صبح و شام

زندگی کی زبان بولتا ہوں
دھوپ کو سائبان بولتا ہوں

زمانہ ختم ہوا لفظ میں تحفظ کا
سو اپنی تیغ کو دریا میں ڈالتا ہوں میں

بدن تو جیسے توجہ طلب رہا دن رات
اس ایک طفل نے پیچھا میرا نہیں چھوڑا

کم حوصلہ ٹھہرا کے مجھے وہ سرِ محفل
کیا لطف ہے اب مجھ سے ہی ایثار طلب ہے

صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی کی شخصیت اور شاعری

صاحبزادہ حسین احمد رحمانی / خیر پور ٹامے والی

ہمارے خاندان کا علم و ادب کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ ہمارے جد امجد مولوی محمد عثمانؒ بڑے عالم فاضل اور ادب شناس شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے بیٹے مولوی عبدالرحمٰن مفکر اسلام اور عربی زبان کے قابل ترین مدرس تھے۔ خیر پور کے سید زمان علی شاہ صاحب ہمدانی آپ کے شاگرد تھے تدریس کے ساتھ ساتھ آپ فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر بھی تھے آپ کا تخلص عاشق تھا آپ کا حضرت خواجہ عبیداللہ ملتانیؒ کے ساتھ بڑا عقیدت و احترام کا رشتہ تھا۔ آپ اکثر ملتان جاتے تو ان کے ہاں قیام فرماتے تھے۔ جب خواجہ عبیداللہ ملتانی اللہ کو پیارے ہوئے تو آپ نے ان کی وفات پر قطعہ بھی لکھا تھا۔ آپ نے حضرت سید سلطان شاہ صاحب تونسویؒ کا حلیہ مبارک فارسی زبان میں لکھا جس کو مولوی عبدالرحیم صاحب نے چھپوایا تھا۔ علاوہ ازیں مولوی گل محمدؒ احمد پوری کے ساتھ روحانی تعلق اور دوستی کا رشتہ تھا جس کی وفات پر آپ نے قطعہ بھی لکھا جو آج بھی ان کے مزار پر لکھا ہوا ہے ان کے مزار پر آپ کے اور بھی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ آپ کی تین بیٹیاں تھیں مگر بیٹا نہیں تھا بیٹے کے لئے آپ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں کرتے تھے اور بزرگوں سے بھی دعا کی اپیل کیا کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی آپ کو آخری عمر میں بیٹا عطا فرمایا۔ جس کا نام مولوی عبدالرحیم رکھا گیا ہے۔

مولوی عبدالرحیم صاحب بے مثل خطیب، شیریں بیاں مقرر اور خوش الحان واعظ تھے۔ علاقے میں آپ کا نام واعظ مولوی عبدالرحیم خانقاہی مشہور تھا۔ آپ مختلف پروگراموں میں واعظ کرتے تھے۔ واعظ کے دوران اکثر موقع محل کے مطابق اشعار بھی پڑھتے تھے لوگ آپ کی تقریر بڑے ذوق اور شوق سے سنتے تھے آپ طاقتور، شہ زور اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ پہلوانی کا بھی آپ کو بہت شوق تھا کھاڑے میں جا کر زور لگاتے تھے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا بیٹے کا نام صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی ہے۔

صاحبزادہ ریاض رحمانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محرم کے علاوہ اپنے چچا خواجہ نور محمد صاحب اور غلام یٰسین کے والد مولانا غلام سرور صاحب کے پاس حاصل کی۔ بعد میں آپ نے بہاولپور کی عظیم درسگاہ جامعہ عباسیہ میں داخلہ لے لیا۔ آپ کو تعلیم کے زمانے میں ہی علم و ادب سے لگاؤ تھا۔ آپ نے اپنے والدِ گرامی کے بارے میں فرمایا:

پیکرِ علم متانت مصدر عقل و سلیم
صاحبِ خلق و معروت مظہرِ وضعِ قدیم
واصفِ شانِ رسالت واعظِ شیریں مقال
زینتِ محراب و منبر مولوی عبدالرحیم

آپ کو مطالعہ کرنے کا بہت شوق تھا جوانی کے آغاز میں شعر و شاعری کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ سرائیکی زبان میں تو استاد الشعراء کی حیثیت رکھتے تھے مگر اردو زبان میں بھی نامور اور ممتاز شاعر تھے آپ نے اپنی زندگی میں ادب کی بہت خدمت کی شروع شروع میں ہی خیر پور میں شعر و سخن کی محفلیں سجاتے تھے۔ سب سے پہلے آپ نے حکیم نصیر الدین قریشی اور پیرزادہ عبدالمجید کے ساتھ مل کر بزمِ ادب قائم کی۔ مرزا نعیم اختر (بہاولپور) بھی اس بزم کا حصہ تھے اس وقت خیر پور کے شعراء میں اختر راہی، حامد علی شاہ گیلانی، قاضی محمد اسلم اور ماسٹر چودھری رانا محمد انور نمایاں تھے اس وقت رحمانی صاحب کے ڈیرہ پر یا کلیم حکیم نصیر الدین قریشی صاحب کے ڈیرہ پر بے شمار ادبی محفلیں سجائی جاتی تھیں اسی طرح خیر پور کے لوگوں میں شعر لکھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہوا آپ نے ہی خیر پور کی سرزمین پر سخن فہمی اور سخن شناسی کی داغ بیل ڈالی۔ میں جب پیدا ہوا تو آپ نے اپنی فیملی کے بارے میں ایک قطعہ لکھا کہ:

نورِ نظر رسید ہے شبیر اور حسین
بلقیس بھی عطیہ ہے رب کریم کا
اک پھول ہے دو غنچے ہیں ایک ننھی سی کلی
ہنستا ہوا ریاض ہے عبدالرحیم کا

خیر پور برادری میں رحمانی صاحب کے ہم عصر پیرزادہ صاحبان کے ساتھ بڑی یاری دوستیاں تھیں جن میں عبدالمجید پیرزادہ، عبدالغفار پیرزادہ، محمد نواز انیس پیر زادہ، مختار احمد پیرزادہ، عبدالستار پیرزادہ۔ میاں محمد مشتاق پیرزادہ عبدالعزیز پیرزادہ وغیرہ تھے۔ جن کے درمیان پرخلوص دوستی اور محبت پائی جاتی تھی۔ جب بھی اکٹھے ہونے کا اتفاق ہوا تو آپس میں علمی وادبی، گفتگو اور بحث و مباحثہ کی محفلیں سجتی تھیں خاص کر کسی شادی یا عرس مبارک کے موقع پر مل بیٹھنے کا اتفاق ہوتا۔ عزت و احترام کے ساتھ ہنسی مذاق اور پرتکلف باتوں کے دور چلتے تھے رات کو بیٹھتے تو ساری رات گزر جاتی تھی ان حسین لمحوں کو ریاض رحمانی صاحب نے اس انداز میں قلمبند کیا کہ:

وہ پیارے لمحے کے یاد جنکی نہ عمر بھر دل سے جا سکے گی
یہ بے قراری نہ دور ہوگی نہ دل کو تسکین آ سکے گی
وہ عرس کی پر بہار محبتیں وہ کیف آور حسین راتیں
وہ حسن کی دلنواز ادائیں وہ عشق کی بے حجاب گھاتیں
وہ حسن اور عشق کے فسانے کبھی محبت کی واداتیں
کبھی سیاست پہ گفتگو اور کبھی تھیں علم و ادب کی باتیں
تمام احباب کی شکایت انیس کی غیر حاضری پر
ہمارے مشتاق کی وہ چوٹیں عزیز صاحب کی سادگی پر
وہ آخری رات جب مغنی نے راگ الاپا تھا ساز لے کو
تو وجد کی کیفیت تھی طاری ستارے رقصاں تھے آسماں پر

صاحبزادہ ریاض رحمانی صاحب ادیب، خطیب، شعبہ بیاں مقرر، باکمال شاعر اور منفرد کالم نویس تھے اس کے علاوہ سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔ متعدد بار ٹاؤن کمیٹی خیر پور کے کونسلر منتخب ہوئے۔ ایک مرتبہ ضلع کونسل بہاولپور کے کونسلر بھی بنے۔ بلدیاتی سیاست میں ان کے ساتھ مولوی غلام حسن محمودی، خان خدا بخش خان عباسی، شیخ محمد

امین، سید غلام علی شاہ، سید عبدالمالک شاہ ہمدانی، وڈیرہ اللہ ڈیوایا خان عباسی، حاجی عبدالمجید بھایا، حاجی عاقل محمد، راؤ عبدالرزاق اور حاجی غلام محمد تھے۔ تقریر کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس لئے آپ جس ایوان میں موجود ہوتے سب سے نمایاں نظر آتے تھے۔ خیر پور میں جب بھی کمشنر صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب یا اسسٹنٹ کمشنر صاحب کا وزٹ ہوتا تو سٹیج پر ریاض رحمانی صاحب کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سال 1967ء میں جب صدر ایوب بہاولپور اسٹیڈیم میں بطور صدر جلسۂ عام سے خطاب کیا تو اس جلسہ میں ریاض رحمانی صاحب نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سر انجام دیئے تھے۔ حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت سے متاثر ہو کر ان کی بیعت ہوئے۔ بخاریؒ صاحب سٹیج پر ریاض رحمانی صاحب سے تقریر کرواتے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ آپ بخاریؒ صاحب کی رفاقت میں بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ بخاریؒ صاحب جب بھی خیر پور میں تشریف لاتے تو رحمانی صاحب کے ہاں قیام فرماتے تھے۔ جب میرے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو اتفاق سے سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ صاحب رحمانی صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے میرے دادا ابو نے بخاری صاحب کو جا کر خوشی خبری سنائی کہ ریاض کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بخاریؒ صاحب خوش ہوئے اور فرمایا اس کا نام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نام پر رشید احمد رکھو تو رشید احمد عثمانی صاحب کا نام سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ صاحب نے رکھا تھا۔ صاحبزادہ ریاض رحمانی صاحب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صاحب کے ساتھ بڑی عقیدت اور نیاز مندی رکھتے تھے ان کی خطابت کے انداز سے متاثر ہو کر آپ نے فرمایا کہ:

لیلائے خطابت کے سنورتے گئے گیسو
ممبر پہ وہ جب بھی ہوا آمادۂ گفتار
جادو بھری تقریر تھی یا موجۂ تسنیم
آواز بخاری کی تھی یا شیر کی للکار
محفل میں جو بیٹھا ہو تو جھونکا تھا صبا کا
منبر پہ کھڑا ہو تو تھا تلوار کی جھنکار
نس نس میں سمایا ہے ریاض اس طرح وہ شخص
اب تک دل و جاں اس کی محبت سے ہیں سرشار

صاحبزادہ ریاض رحمانی صاحب بذاتِ خود بہت اچھے انسان تھے۔ غریب پرور، مشفق اور خلقِ خدا سے بے پناہ محبت کرنے والے شخص تھے۔ ہمیشہ آپ کا دروازہ غریب، بے کس اور دکھی انسان کے لئے کھلا رہتا تھا۔ جو سائل آتا آپ اس کی تسلی سے بات سنتے اور اس کا مسئلہ حل کروانے میں بھرپور کوشش کرتے جو بھی آس امید لے کر آتا آپ اس کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے تھے لوگ آپ کے حسنِ اخلاق کے گرویدہ تھے۔ آپ نے تمام زندگی خیر پور تعمیر و ترقی میں بسر کر دی۔ خیر پور سے آپ کو بڑی اُنسیت اور لگاؤ تھا۔ آپ کے اندر بڑی خداداد صلاحیت تھی۔ اگر خیر پور چھوڑ کر لاہور چلے جاتے تو پورے ملک میں آپ کو بے پناہ شہرت ملتی اور ایک اعلیٰ منصب پر فیض ہوتے اور ملک کے نامور چند شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا۔ جس شہر کو آپ نے پوری زندگی وقف کر دی جب اس شہر میں پیار محبت اور خلوص کی کمی آتے دیکھی تو آپ نے دل برداشتہ ہو کر اپنے شہر کے بارے میں کہا کہ:

کتنا بدل گیا ہے نئی نسل کا مزاج
باقی نہیں بزرگوں کی عزت کا اب رواج
خانہ بدوش بن کے بھٹکنا قبول ہے
اس شہرِ بے لحاظ میں رہنا فضول ہے
لگنے لگی ہے اجنبی مجھ کو یہ زندگی
جو شہر میرا شہر تھا یہ شہر وہ نہیں

آپ نے سال 1973ء میں خیر پور میں بزم ریاض رحمانی بنائی جس کے زیر اہتمام باقاعدگی سے پندرہ روزہ طرحی مشاعروں کے علاوہ بموقع عرس مبارک عظیم الشان سالانہ نعتیہ مشاعرہ منعقد کرواتے رہے۔ جس میں جنوبی پنجاب کے نامور شعراء کرام آپ کی درخواست پر شرکت فرماتے تھے عید ملن پارٹی یا قومی تہوار کے سلسلے میں شعر و سخن کی محفلیں سجاتے تھے اور بزم ریاض رحمانی خیر پور نے مختلف اوقات میں جانباز جتوئی، محسن نقوی، عزیز حاصل پوری، نقوی احمد پوری، دلشاد کلانچوی، ارمان عثمانی، ظہور احمد ظہور پاکپتن، عباس تابش، مشکور کتب پوری، کرنل جاذب ترین، فیض محمد دلچسپ، ارشد ملتانی، خورشید بیگ میلسوی، شاکر شجاع آبادی، قمر رضا شہزاد، کنور امتیاز احمد، نصر اللہ خاں ناصر، عمر کمال خاں، ظہور نظر، ندیم بھابھہ، اُمید ملتانی، اللہ بخش یاد، فرحت ملتانی، خدا بخش دل شوق، منظور حسین اسد، خورشید ناظر، عابد صدیق، منور جمیل قریشی، علی اطہر اثر نقوی، حشمت دہلوی، رب نواز محمدی، سفیر لاشاری، پروفیسر مظہر مسعود، عبدالکریم شاد، فیاض بخاری، سرور قریشی، فدا حسین شہباز، سیّد مقصود حسین آتش، مقبول احمد تنویر، دلدار بلوچ، احمد بخش سوالی، عبدالواحد عباس، محمد یار پرسوز، مقبول احمد تنویر، دلدار بلوچ، محمد اقبال بہلول، بشیر احمد نوکر، امیر بخش دانش، فضل حسین ذوق، غلام حسین ساجد، معین نجمی، میاں نجم الحق نجم، پروفیسر نظیر طارق، عبدالرحمٰن ادب، محمد امین ساجد سعیدی، ابراہیم حسان اور پی ٹی وی کے پروڈیوسر مشتاق صوفی نے بھی لاہور سے آ کر شرکت کی اور دوسرے کئی نامور شعراء کے اعزاز میں شعر و سخن کی یادگار محفلیں منعقد کی جاتی رہیں جس سے المدد کی خدمت بھی ہوتی رہی اور بزم کو ملک گیر شہرت بھی ملی۔ آپ نے بے شمار اپنے شاگرد پیدا کیے جو آج شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں جس میں حسن عباسی نے علمی ادبی میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں اپنا نام پیدا کیا۔ اور ادبی محفلوں میں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ جس کا حسن عباسی خود اعتراف کرتے ہیں کہ یہ میرے اُستاد صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی کا فیض ہے۔ اسلامی یونیورسٹی بہاولپور نے صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی کا تھیسز بھی منظور کیا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس نے ایم اے کرتے ہوئے ان پر تھیسز بھی لکھا۔ آپ کی مشہور و معروف نعت جو پورے ملک میں سنی اور پسند کی جاتی ہے۔

خدا کا نام نہ لے وہ بھی خدا کے لیے
کہ جس کا دل نہ دھڑکتا ہو مصطفیٰ کے لیے
لغت تمام ہوئی وصف مصطفیٰ میں ریاض
کہاں سے لاؤں نئے لفظ التجا کے لیے

(ریاض رحمانی)

علم کی حقیقت

علی لاشاری/کراچی

اللہ کے نام سے شروع جس نے کامیابی اور ناکامی دونوں میں انسان کے لیے سبق رکھا ہے۔

علم اور معلومات میں وہی فرق ہے جو Infrormation اور Knowledge میں ہے۔ علم ایک بے پایاں سمندر ہے۔ کوئی ایک لفظ کی بھی اسم اور فعل کی تمام کیفیات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ علم کیا، علم کی حقیقت کیا جی ہاں اصل سوال تو سب سے پہلے یہ ہے کہ جس چیز پر آپ زندگی لگا دیتے ہیں۔ آخر وہ علم ہے کیا؟ یہ سوال اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ علم کی تاریخ پرانی ہے اور اتنا ہی جدید ہے جتنا کہ آج کی سائنسی معلومات۔ Knowledge Scientific اصولی علم کہتے ہیں۔ علم کی حقیقت یا تھیوری آف نالج (Knowledge of Theory) کہتے ہیں۔ علم وہ ہے جس کی استعداد تمام انسانوں میں رکھ دی گئی ہے۔ اسے دور کی اصطلاح میں سائنسی علوم کہا جاتا ہے۔ اب یہ انسان پر ہے کہ اس کا آئینہ فکر کس قدر پاک وشفاف ہے؟ وہ کس قدر منطق غلطیوں سے ماورا ہو کر سوچتا ہے۔ جس قدر انسانی عقل میں نکھار ہوگا، نظریات کی اتنی ہی بہتر تصویر اس کو نظر آئے گی۔ یگانہ چنگیزی نے اس خیال کو شعر کی صورت میں بیان کیا ہے:

علم کیا، علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئے

علم کی ایک ایسی جامع تعریف جو دنیا کے ہر مذہب کے ماننے والے یا مذہب کے نہ ماننے والوں کے نزدیک بھی قابل قبول ہو۔ کائنات میں موجود تمام رموز واسرار جن کو طبیعیاتی یا مابعد الطبیعیاتی، تصور یا تشکیل کو نزیل، الہام، وحی، خیال تصور، تشکیل، مشاہدہ، تجزیاتی و تجزیاتی، حسی، نظری، بصری طور پر کلی یا جزوی طور پر جاننے کا نام علم ہے۔ حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کمیل سے ارشاد فرمایا: اے کمیل! علم مال سے بہتر ہے۔ علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی، علم حاکم ہے اور مال محکوم ہے۔ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایک اور موقع پر مولا علیؑ نے فرمایا دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر جاگ کر عبادت کرنے والے مجاہد سے علم افضل ہے۔ علم جب وفات پاتا ہے تو دنیا میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے اس کا جانشین ہی پر کر سکتا ہے۔ علم کی فضیلت میں مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے یہ تین اشعار بھی مشہور ہیں:

ما الفخر الا لا هل العلم انهم
علی الهدی لمن استهدی ادلاءً
وقدر کل امری ما کان یحسنه
والجاهلون لا هل العلم اعداء
ففز بعلمٍ تعش حیاته ابداً
الناس موتی و اهل العلم احیاء

ترجمہ: فخر کا حق صرف علماء کو حاصل ہے کہ وہ خود بھی ہدایت پر ہیں اور طالبان ہدایت کے رہنما بھی ہیں۔ انسان کی قدر اچھائی سے ہے۔ یوں جاہل اہل کے دشمن ہوتے ہی ہیں۔ ایسا علم حاصل کر جس سے ہمیشہ ہمیش زندہ رہ سکے۔ لوگ مر جائیں گے صرف اہل علم زندہ رہیں گے۔ آٹھ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی صوفی ازم کا بہترین نمونہ محمد جلال الدین رومی (مولانائے روم) رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے اکابر علماء میں سے تھے۔ فقہ اور مذاہب کے بہت بڑے عالم تھے۔ دیگر علوم میں بھی مولانا کو پوری دست گاہ حاصل تھی۔ مولانا منطق اور فلسفہ کے امام تھے اور ہیں۔ وہ تیرھویں صدی کے فارسی زبان کے شاعر، قانون دان، اسلامی وودوان، مذہبی گورو اور صوفی روحانی تھے۔ مشہور یہ ہے کہ مولانا نے مثنوی کا چھٹا دفتر نا تمام چھوڑا تھا اور فرمایا تھا:

باقی ایں گفتہ اید بے زباں
درد دل ہر کس کہ دارد نور جان

ترجمہ: جس شخص کی جان میں نور ہوگا اس مثنوی کا بقیہ حصہ اس کے دل میں خود بخود اُتر جائے گا۔ ہمارے شاعر مشرق علامہ محمد اقبال مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد متاثر تھے۔ آپ ان کو اپنا روحانی مرشد بھی مانتے تھے اور آپ کی اردو اور فارسی اشعری میں مولانا کی جھلک بھی ہمیں نظر آتی ہے۔

اللہ رب العزت نے اس بات پر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود/ لائق عبادت نہیں اور اہل علم والوں نے بھی (اور ساتھ یہ بھی) کہ وہ ہر تدبیر عمل/ باعتدال کے ساتھ انتظار رکھنے والے ہیں۔ اس آیت کی کیفیت اور درد دیدہ نگاہی کیجیے کہ اللہ رب العزت نے شہادت کی ابتدا اولاً اپنی ذات سے فرمائی، پھر فرشتوں کا ذکر فرمایا اور تیسرے نمبر پر اہل علم کا ذکر کیا۔ اہل علم کی فضیلت، عظمت اور شرف پر یہ بڑی دلیل ہے۔ بعض دانشوروں کا قول ہے کہ جس طرح بدن کی زندگی غذا سے ہے اس طرح دل کی زندگی علم و حکمت سے ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کے حسنہ سے مراد علم اور عبادت اور آخرت کے حسنہ سے مراد جنت ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اگر علماء کے قدموں کی سیاہی اور شہیدوں کا خون تولا جائے تو سیاہی کا وزن زیادہ رہے گا۔ جان لو کہ عالم ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ علم سیکھنے سے آتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رات میں تھوڑی دیر علم کا تذکرہ کرنا میرے نزدیک تمام رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

مظہر نیازی/میاں چنوں

ہوگا نہ منکشف تو کبھی اپنی ذات پر
دروازہ کھول، شور مچا اور دہائی دے

طوافِ خانۂ کعبہ کے انتظار میں تھا
میں رجز پڑھتا ہوا فتح کے خمار میں تھا
اِدھر اُدھر کھڑی دنیا درود پڑھ رہی تھی
میں ذکرِ یار میں مشغول ایک غار میں تھا
مرے شہید خدا سے کلام کر رہے تھے
میں تیغ اُٹھائے ہوئے تنہا ریگزار میں تھا
مجھے شکست کا ڈر تھا نہ فتح کی خواہش
میں نینوا میں کسی حُر کے انتظار میں تھا
تری نظر نے سنبھالا قدم قدم مجھ کو
مرا وجود کہاں میرے اختیار میں تھا
سیاہ شام مناتی رہی ہمیں مظہر
بہادروں کا قبیلہ کب اختیار میں تھا

وہ حسیں جب سے میرے دھیان میں ہے
ایک خوشبو سی جسم و جان میں ہے
کل سرِ راہ تیری بات چلی
اب تلک ذائقہ زبان میں ہے
دن مزے سے گزر رہے ہیں مرے
آج کل وہ مرے مکان میں ہے
جب سے میں اس سے مل کے آیا ہوں
ہر طرف زندگی اُڑان میں ہے
مجھ وحی زاد پر یقین اُتار
وسوسوں میں ہے دل، گمان میں ہے
یہ جو میں ہشت رنگ رہتا ہوں
معجزہ دستِ مہربان میں ہے
کٹ گیا پیڑ گھر کے آنگن کا
دھوپ کا شور سارے لان میں ہے
مجھ میں مظہر ہے روشنی اُس کی
وہی ضو ریز شمع دان میں ہے

بات کی جب دھوپ نے بھی چھاؤں کی
ریت اُچھلنے لگ گئی صحراؤں کی
آج تک آواز دیتی ہے اُسے
ایک پگڈنڈی ہمارے گاؤں کی
چل دیا وہ سب تعلق توڑ کر
کٹ گئی زنجیر میرے پاؤں کی
کچے گھر کے خواب اندھے ہو گئے
خاک اُڑتی دیکھ کر آشاؤں کی
آنکھ، دل، اخلاص مظہر ایک سا
ایک جیسی ہے محبت ماؤں کی

مَیں نے یہ کب کہا ہے مجھے اولیائی دے
مولا، مرے وجود کو پوری اکائی دے
قید بدن میں حبس زدہ ہو رہا ہوں میں
اس شہرِ بے ثبات سے مجھ کو رہائی دے
ہوگا نہ منکشف تو کبھی اپنی ذات پر
دروازہ کھول، شور مچا اور دہائی دے
مسند نشین تخت سے سولی پہ آ گئے
ہر سو صدائے شہرِ ستمگر سنائی دے
جس خاک داں کو تیرا حوالہ بتاؤں میں
تخلیقِ کائنات کا مظہر دکھائی دے

خوشبوؤں کا الگ قبیلہ ہے
بستیاں ہیں الگ سرابوں کی
راستے ایک ہیں عذابوں کے
ہر طرف اس قدر اندھیرے ہیں
اپنی آہٹ سے کانپ جاتا ہوں
آ کے، تنہائی بانٹ لو مجھ سے

آخر شب زوال کا منظر
کھو گیا بانکپن کہانی کا
آنکھ نمناک ہو گئی پھر سے

موسموں کا یہی تقاضا ہے
شہر بے حس کے بے خبر باسی
تتلیوں کی اُداسیاں سمجھیں

تیری یادوں کی چاندنی میں دل
رات تاروں سے ہم کلام رہا
بالکونی میں پھول کھلتے رہے

لہو بہا کے اُجالوں کا روپ دھار گیا
چراغ بجھ کے اندھیروں کا قرض اُتار گیا
کہاں گئے مری چڑیوں کے گھونسلے آخر
مرے درختوں پہ شب خون کون مار گیا
پھر اب کے لوگوں کی فصلوں پہ پھر گیا پانی
پھر اب کے بارشِ رحمت کا اعتبار گیا
یہ کس نے میرا تعارف کرا دیا مجھ سے
یہ کون مقتلِ جاں سے مجھے گزار گیا
لبِ فرات کے اُس معرکے میں آخرکار
زمین جیت گئی، آسمان ہار گیا
عجیب آنکھیں تھیں اُس اجنبی مسافر کی
ستم ظریف مجھے اک نظر میں مار گیا
بٹھا کے چاند کی کشتی میں کل مجھے مظہر
وہ دور ساحلِ شب پر کہیں اُتار گیا

انور ندیم علوی/نواب شاہ

ساتھ جس کے سایہ بن کر زندگی بھر میں چلا
آ کے منزل پر کھلا وہ ہم سفر میرا نہیں

آنکھ گو روتی رہی آنسو مگر اُچھلا نہیں
ہم نے اپنا درد دنیا پر کبھی کھولا نہیں
دائرہ در دائرہ اس کی کشش زنجیر پا
پیار کا قیدی کسی صورت رہا ہوتا نہیں
نگری نگری گاؤں گاؤں سوچ کا پنچھی اُڑے
ہمنشیں! لیکن یہ ہجرت کا سفر گھٹتا نہیں
اس کی خاطر فرشِ رہ ہیں کتنی پلکوں کے گلاب
کتنے ماہ و سال سے جو شخص گھر آیا نہیں
گھر کی ہر دیوار پر روشن وفاؤں کے چراغ
وصل کی اُمید کا تارا کبھی ڈوبا نہیں
خونِ دل سے پیار کا دیپک جلاؤ تم ندیم
نفرتوں کی آندھیوں سے یہ دیا بجھتا نہیں

سچ اس کی خطا ہے یہ بتا کیوں نہیں دیتے
منصور کو سولی پہ چڑھا کیوں نہیں دیتے
شاید کسی گم گشتہ کو مل جائے ٹھکانہ
اک دیپ اندھیرے میں جلا کیوں نہیں دیتے
پلکوں پہ گزرتے ہیں جدائی کے ستارے
موتی یہ محبت کے لٹا کیوں نہیں دیتے
نفرت کی گھٹا نے کیے تاریک شب و روز
اس شب کو محبت کی ضیاء کیوں نہیں دیتے
اک چاند تڑپتا ہے جدائی میں اکیلا
اُس چاند کو تاروں سے ملا کیوں نہیں دیتے

نامکمل زندگی کا سارا نقشہ رہ گیا
عشق گو بے لوث تھا لیکن ادھورا رہ گیا
خود سے بھی کیسے ملے اب وقت کتنا رہ گیا
کاروبارِ زیست میں انسان تنہا رہ گیا
کوئی منطق جاننے والوں کو نہ قائل کر سکی
بھیگی پلکوں پر مچلتا ایک دریا رہ گیا
آندھیاں غم کی چلیں ایسی مٹے نقشِ وفا
اک تنے پر میرا اس کا نام لکھا رہ گیا
دل، دماغ اور سوچ میں وہ لمحہ لمحہ تھا شریک
اس کے جاتے ہی جہاں سے میں بھی آدھا رہ گیا
پیار کی خاطر یہ کس نے چھوڑ دی دنیا ندیم
میں تو تھا ہی دم بخود سارا زمانہ رہ گیا

خواہشوں کا ہے بہت گہرا سمندر دیکھنا
ڈوب جاتے ہیں شناور اس کے اندر دیکھنا
جھلملاتے ہیں وفاؤں کے یہاں کتنے چراغ
دل کے مندر میں کبھی تم بھی تو آ کر دیکھنا
درد سے لبریز جب میں نے سنائی داستاں
یاد ہے ان کا مجھے بادیدۂ تر دیکھنا
ہجر کے غم سے جلے آخر وفاؤں کے گلاب
آنسوؤں سے جب نہ بجھ پایا یہ اخگر دیکھنا
وقتِ رُخصت حالِ دل کیسے چھپاؤ گے ندیم
ہے تلاطم خیز اشکوں کا سمندر دیکھنا

چاند چکور کا ملنا گو اس دنیا کو منظور نہیں
لیکن پیاس بڑھاتے جانا ساقی کا دستور نہیں
سات سمندر کی یہ دوری طائرِ دل نے طے کر دی
آنکھ سے اوجھل ہے وہ لیکن دل سے تو ہرگز دور نہیں
روشن روشن چہرہ ان کا، باتوں میں بھینی بھینی خوشبو
لاکھوں چہرے دیکھے ہیں پر ان میں ایسا نور نہیں
ان کا چہرہ دیکھے تو یہ چاند بھی شرما جاتا ہے
وہ حسن میں ماہِ کامل ہے اور ظاہر ہے مستور نہیں
پت جھڑ کا یہ لمبا عرصہ بیت گیا دل کہتا ہے
پھول کہیں کھلتے جس موسم میں وہ موسم اب دور نہیں

اس کی دیوار اجنبی ہے اس کا در میرا نہیں
درحقیقت جس میں رہتا ہوں وہ گھر میرا نہیں
دائروں کے درمیاں چلتے ہوئے مدت ہوئی
منزلیں ہوں جس کا محور، وہ سفر میرا نہیں
ظلم و استبداد سے نفرت ازل سے ہے اصول
سامنے باطل کے جھک جائے وہ سر میرا نہیں
ہر طرف نفرت کی دیواریں، فصیلیں بغض کی
ہو مبارک تجھ کو ہمدم یہ نگر میرا نہیں
ساتھ جس کے سایہ بن کر زندگی بھر میں چلا
آ کے منزل پر کھلا وہ ہم سفر میرا نہیں
آبیاری کی تھی جس کی خون سے میں نے ندیم
چھاؤں اس کی ہے پرائی وہ شجر میرا نہیں

نواب شاہ سندھ میں مقیم
چودہ سے زائد شعری مجموعوں کے خالق
انور ندیم علوی کا تازہ شعری مجموعہ
پلکوں کے گلاب شائع ہوگیا ہے
صفحات 272 قیمت: 500 روپے
ناشر: زربفت پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور

عقیل شاہ/راولپنڈی

رونے سے مجھے خلقف خدا روک رہی تھی
پھر میری طرف داری میں بادل نکل آئے

ہاتھ بھی مجھ سے ہوا اور ستم ایجاد بھی میں
اب تو مر جاؤں اگر اس کو کروں یاد بھی میں
قید سے کیسے نکلتے ہیں مجھے کیا معلوم
ٹھیک سے کر نہیں پاتا ابھی فریاد بھی میں
اے مرے گھر مرے بچوں پہ کوئی بوجھ نہ ڈال
در و دیوار بھی میں ہوں تری بنیاد بھی میں
خون کی پیاسی اُداسی نہیں فرصت ورنہ
وقت دیتا تجھے، کرتا تری امداد بھی میں
آس اور یاس کی مجھ میں عجب آمیزش ہے
صبح کا نغمہ بھی میں شام کی فریاد بھی میں
اپنے ہی سانس سے کٹتا ہوں شب و روز عقیل
کوہ بھی میں ہوں یہاں تیشہ فرہاد بھی میں

بڑی چوروں کو آسانی ہے مجھ میں
کسی اندھے کی نگرانی ہے مجھ میں
مری آنکھوں سے باہر جھانکتا ہے
نجانے کون زندانی ہے مجھ میں
دلِ افسردہ نے وہ گُل کھلائے
جہاں تک دیکھوں ویرانی ہے مجھ میں
بہت بے چین رہتی ہے مری روح
اسے کوئی پریشانی ہے مجھ میں
کھلا یہ رازِ چشمِ تر سے مجھ پر
سمندر سے فزوں پانی ہے مجھ میں
خدا کو آزماؤں لمحہ لمحہ
بڑی کافر مسلمانی ہے مجھ میں

گلیوں میں لہو ریزی کا کچھ حل نکل آئے
لوگ اس لیے خود جانبِ مقتل نکل آئے
میں کاسہ بدستوں کے قبیلے کا ہوں لیکن
خوش قسمتی سے ہاتھ مرے شل نکل آئے
رونے سے مجھے خلقِ خدا روک رہی تھی
پھر میری طرف داری میں بادل نکل آئے
اک سطحِ محبت پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
ایسا نہ ہو یہ جھیل بھی دلدل نکل آئے
افسوس کہ اب بھی ہیں ترے دام میں کچھ کچھ
ہم سمجھے تھے اس بار مکمل نکل آئے
آباد رہے شہرِ خموشاں کسے معلوم
مجھ ایسا مسافر یہاں کس پل نکل آئے

خمیدہ راہ کو سیدھا غلط بتایا ہے
کسی نے اندھوں کو رستہ غلط بتایا ہے
ضرور چور تھا اس مرنے والے کے دل میں
تبھی خزانے کا نقشہ غلط بتایا ہے
میں ایک بات بتاتا مگر بزرگوں نے
ہر ایک بات بتانا غلط بتایا ہے
یہاں پہ رہتا نہیں کوئی قیس نام کا شخص
کسی نے آپ کو صحرا غلط بتایا ہے
حیات واقعی مشکل ہے یا مجھے دل نے
گزارنے کا طریقہ غلط بتایا ہے
ہماری دربدری کیوں پسند ہے اُس کو
نجانے کیوں پتہ اپنا غلط بتایا ہے
جدید دور کے درویش ہیں عقیل ہمیں
حریف نے سگِ دنیا غلط بتایا ہے

ایک ہی دشت تھا وہ بھی نہ کھنگالا میں نے
دل پہ لینا نہیں تھا پاؤں کا چھالا میں نے
گھر کے ڈھ جانے میں غفلت مری شامل تھی مگر
سارا ملبہ در و دیوار پہ ڈالا میں نے
کاش میں اپنے عزاداروں کو بتلا سکتا
کیسا دکھ تھا وہ جسے موت سے ٹالا میں نے
آخرکار غلامی سے بغاوت کر دی
اور زنجیر کو شمشیر میں ڈھالا میں نے
اور پھر اک روز ہمیشہ کے لیے کھو گیا میں
یعنی اک روز اسے ڈھونڈ نکالا میں نے

اُسی کو دوست رکھا دوسرا بنایا نہیں
کئی بناتے ہیں میں نے خدا بنایا نہیں
یہ بستی رات کا کس طرح سامنا کرے گی
یہاں کسی نے بھی دن میں دیا بنایا نہیں
پتہ کرو کہ یہ نقاش کس قبیل کا ہے
پرندہ جب بھی بنایا رہا بنایا نہیں
یہ لوگ ظلم کما کر شب ایسے سوتے ہیں
خدا نے جیسے کہ روزِ جزا بنایا نہیں
لہو بھی جلتا ہے جھڑتی ہے خاک بھی میری
کہ شعر اُترتا ہے لیکن بنا بنایا نہیں
اُداس دیکھا نہیں جاتا کوئی مجھ سے عقیل
کسی کو اس لیے حال آشنا بنایا نہیں

احسان گھمن/جلال پورچٹاں

ہم نہیں دیکھتے زرخیز زمینوں کی طرف
ہم وہ پودے ہیں جو دیوار میں اُگ آتے ہیں

یہ جو ہم صورتِ اشجار میں اُگ آتے ہیں
تم سمجھتے ہو کہ بیکار میں اُگ آتے ہیں
ہم نہیں دیکھتے زرخیز زمینوں کی طرف
ہم وہ پودے ہیں جو دیوار میں اُگ آتے ہیں
جتنی رفتار سے تم کاٹتے جاتے ہو ہمیں
پھر سے ہم اتنی ہی مقدار میں اُگ آتے ہیں
جن کو گلدان میں رکھنا نہیں آیا ہے ہمیں
پھول وہ وحشت کہسار میں اُگ آتے ہیں
سب کو سرداری بزرگی سے نہیں ملتی ہے
ایسے سر بھی ہیں جو دستار میں اُگ آتے ہیں
اپنے اوصاف نہیں بولتے احسانؔ کبھی
بیج پھل پھول جو اشجار میں اُگ آتے ہیں

اے میرے شہرِ عشق ترا کیسا بخت ہے
میں جس کو دیکھتا ہوں وہی لخت لخت ہے
خوش ہو رہا ہوں اس لیے مٹی پہ بیٹھ کر
یارو یہی زمین مرا پہلا تخت ہے
چھاؤں کی جستجو بھی کہاں لے کے آ گئی
صحرا سے پوچھتا ہوں کہیں پر درخت ہے
دنیا مرے مزاج کو سمجھی نہیں ابھی
شاید اسی لیے میرا لہجہ کرخت ہے
اک پل میں کیسے نکلوں میں دنیا سمیٹ کر
ساری زمیں پہ بکھرا ہوا میرا رخت ہے
احسان وہ تو پھول سے نازک لگا مجھے
میں تو سمجھ رہا تھا وہ پتھر سے سخت ہے

جب پر پرواز میرا آسماں میں آ گیا
اک پرندہ بھی صف سیارگاں میں آ گیا
میں پس پردہ کوئی گمنام سا کردار تھا
ذکر میرا کیسے تیری داستاں میں آ گیا
یہ ضروری تو نہیں ہجرت پرندے ہی کریں
دھوپ جس کو بھی لگی وہ سائباں میں آ گیا
آسماں پر اک دیے کی لو اُچھالی تھی فقط
لوٹ کر سارا اُجالا خاکداں میں آ گیا
جب مری عمرِ رواں اُنگلی پکڑ کر چل پڑی
دیکھ میں پھر سے ترے وہم وگماں میں آ گیا
میں نے چکھی تھی کسی کے نرم لہجے کی مٹھاس
کیا بتاؤں ذائقہ کیسا زباں میں آ گیا
ایک صحرا چل پڑا احسانؔ میرے ساتھ کیا
وہ بھی میرے حلقۂ آوارگاں میں آ گیا

میں حیران تھا منظر کی حیرانی پر
پھول کھلے تھے بہتے ہوئے جب پانی پر
میرے کپڑے دیکھ کے مٹی بول پڑی
گھاس اُگاؤ میری بھی عریانی پر
میں نے تیرا نام لکھا جب تاروں پر
چاند ہنسا تھا میری اس نادانی پر
یاد کرو جس رات اکٹھے بیٹھے تھے
گھنٹوں بات چلی تھی رات کی رانی پر
دیکھے ہیں کچھ دیکھے بھالے لوگ یہاں
کس نے گھر آباد کیا ویرانی پر
میں نے اک سجدے میں رات گزاری ہے
یونہی نئیں یہ چاند بنا پیشانی پر

اُجالے ملتے بھلا کیسے رات کاٹنے سے
کہ تیرگی نہیں گھٹتی چراغ بانٹنے سے
فضا میں اُڑتے پرندے بھی سمت بھول گئے
ہوا میں گرہیں پڑیں ایسی پیڑ کاٹنے سے
میں جانتا ہوں بیاباں کی بھید بھاؤ مگر
خزاں کی دھوپ نکھرتی ہے پھول چاٹنے سے
یہ سوچ کر میں کبھی دل کو رد نہیں کرتا
بگڑ ہی جائے نہ بچہ روز ڈانٹنے سے
جو پہلے تھی وہی نفرت ہے اس کے دل میں ہنوز
کہ یہ خلیج ہوئی کم نہ میرے پاٹنے سے
یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے احسانؔ
کبھی کو پھول نہیں ملتے شاخ چھانٹنے سے

کیسی باتیں چراغ پوچھتے ہیں
اپنی ماتیں چراغ پوچھتے ہیں
وہ ستارہ ہے یا کوئی جگنو
اس کی ذاتیں چراغ پوچھتے ہیں
تم اندھیرے میں بیٹھ کر سننا
کتنی باتیں چراغ پوچھتے ہیں
اب ہوائیں کدھر سے آئیں گی
سبھی گھاتیں چراغ پوچھتے ہیں
اس لیے رات لڑکھڑاتی ہے
کائناتیں چراغ پوچھتے ہیں

سیّد شہباز گردیزی/باغ کشمیر

حیف مجھ پر کہ تم سے پوچھتا ہوں
پھول کھلتے ہیں کس مہینے میں

جب بھی میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی
سب نے مجھ کو چپ رکھنے کی کوشش کی
ٹھیک ہے میں اس کوشش میں ناکام رہا
لیکن میں نے خوش رہنے کی کوشش کی
میں یہ سمجھا اس نے مجھ کو چاہا ہے
اُس نے میرا دل رکھنے کی کوشش کی
جانے میں جو سمجھا ہوں وہ ٹھیک بھی ہے
جانے اس نے کیا کہنے کی کوشش کی
وہ بھی میرے بعد سنا ہے خوب جیا
میں نے بھی زندہ رہنے کی کوشش کی

وہ خود تو چین سے بیٹھا ہوا ہے
مجھے کیوں دربدر رکھا ہوا ہے
مری آنکھوں میں خوابوں کا سمندر
درِ امکان تک پھیلا ہوا ہے
کسی کے ذکر پر ایک سانس ہی کیا
رگوں میں خون بھی ٹھہرا ہوا ہے
تری آنکھوں میں یہ جو خواب سا ہے
اسے میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے
میں جیسے رات کا پچھلا پہر ہوں
وہ جیسے چاند سے اُترا ہوا ہے
وہ موتی بن کے ٹپکے گا کسی دن
جو قطرہ آنکھ میں ٹھہرا ہوا ہے
تجھے بھی زعم ہے اپنی انا کا
تو کیا تو آگ سے پیدا ہوا ہے
کبھی یہ دشت پھولوں سے بھرا تھا
ہمارے سامنے صحرا ہوا ہے

ہماری جیت سے ہوتی تمہاری ہار میاں
سو بڑھ کے روک لیا خود ہی اپنا وار میاں
ندی کے بیچ ہے برق و شرر کا ایک مقتل
اور اپنا شیش محل ہے ندی کے پار میاں
ہمارے جیسی کوئی ایک مثال ہو تو کہو
کہ ہم کو خود سے زیادہ ہے تم سے پیار میاں
بس ایک دیکھیے یہ ہجراں کی آگ میں جھونکا
تمہارے وصل سے ہوتا جو ہم کنار میاں
تمہارے پیچھے چلے آئیں گے یہ کون و مکاں
طلب کے ناکے سے پہلے ہمیں گزار میاں
ہے ایک وہم مسلسل نظامِ بسط و کشاد
یہ کارگاہِ عناصر ہے ہم پہ بار میاں
اب اپنے کاسۂ رختِ سفر میں کچھ بھی نہیں
لباسِ خاک بھی میت سے لے اُتار میاں

اک طرب ہی نہیں خزینے میں
خیمہ رنج ہے دفینے میں
عمر بھر طے نہ ہو سکا مجھ سے
رنج مرنے میں ہے یا جینے میں
حیف مجھ پر کہ تم سے پوچھتا ہوں
پھول کھلتے ہیں کس مہینے میں
میں سمجھتا تھا کچھ نہیں ہوگا
چھید کرتے ہوئے سفینے میں
یار نظروں سے ہو گیا اوجھل
رہ گئی داستاں سینے میں
کوفہ و کربلا سے آیا ہوں
دل نہیں لگ رہا مدینے میں

وہ میرے بعد اک حقیقت ہے
جس طرح یاد اک حقیقت ہے
مجھ پہ تعمیر جو فسانہ ہے
اُس کی بنیاد ایک حقیقت ہے
میں ہوں ایک خواب کے تصرف میں
جس میں آباد ایک حقیقت ہے
جھوٹ ہے شانِ خسروی لیکن
کارِ فرہاد ایک حقیقت ہے
جس طرح تو کبھی حقیقت تھی
اب تری یاد ایک حقیقت ہے

اس امتحان سے ہر ایک گزارا جائے گا
بدن لباس ہے جس کو اُتارا جائے گا
کسی کا کچھ نہیں جائے گا جانے والے سُن
تمہارے جانے سے سب کچھ ہمارا جائے گا
نکالے جانے کی تکلیف جو نہیں بھولا
وہ شخص باغِ عدن میں دوبارہ جائے گا؟
فضائے کوفۂ نامہرباں بلاتی ہے
مجھے بھی دشتِ مصیبت میں مارا جائے گا
وہیں تلک ہے میاں آسرا صداؤں کا
ندی کے ساتھ جہاں تک کنارا جائے گا
کسی جمال کے بندے میں دفن ہے شہباز
وہ جس مقام سے سورج اُبھارا جائے گا

گلی نمبر 10

امین کنجاہی/

ہم لوگ جب 1965ء میں سمندری سے راولپنڈی شفٹ ہوئے تو ہمارے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، اور فوری طور پر کوئی کرائے کا مکان بھی دستیاب نہیں تھا، چنانچہ میرے والد نے اپنے بڑے بھائی سے کہا، کہ پاجی میں کچھ دن کے لئے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپ کے گھر میں رہ سکتا ہوں، تو اُنھوں نے بڑی خوش دلی سے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں، اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے، گوکہ میرے تایا جی کی فیملی ماشاءاللہ کافی بڑی تھی، اُن کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اور سب کے سب جوان تھے، ایک بیٹے کی شادی ہوچکی تھی، اور اُن کی بہو بھی اسی گھر میں رہ رہی تھیں، گھر میں داخل ہوتے ہی، ایک ڈیوڑی تھی، اور دروازہ کھولتے ہی سیدھے ہاتھ پر سیڑھیوں کا راستہ تھا، جو اوپر جانے کا راستہ تھا، اور دو قدم اُلٹے ہاتھ پر ایک بیٹھک تھی، جہاں پر اُن کی بہو اور بیٹا رہتے تھے، جب ڈیوڑی ختم ہوتی تھی، تو سیدھے ہاتھ پر، غسل خانہ تھا، درمیان میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، چند قدم آگے جاکر اُلٹے ہاتھ پر، ایک باورچی خانہ تھا، اور باورچی خانے سے بلکل تھوڑا سا آگے جاکر ایک بڑا سا کمرہ تھا، جسے پسار کہتے تھے، اُس پسار میں پانچ چھ چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں، اور اُسی پسار کے اندر ایک چھوٹی سی پارٹیشن تھی، جو کہ ڈریسنگ روم کا کردار ادا کرتی تھی، اور اُس ڈریسنگ روم میں بھی ایک بڑا سا پلنگ بچھایا گیا تھا، یہ گھر کوئی چار ساڑھے چار مرلے کا گھر تھا، جس کے اندر، یہ سب لوگ رہائش پذیر تھے، ہم لوگ جب سمندری سے آئے تو ہم لوگ بھی پانچ بہن بھائی اور والدین تھے، مگر نا ہی ہماری تائی اماں نے کبھی ماتھے پر بل ڈالے، کہ یہ کیوں اتنے سارے لوگ آگئے ہیں، ایک دم سے ہمارے گھر میں تو آگے ہی جگہ کم ہے، اور نہ ہی، اُن کے بچوں کی طرف سے ہمیں کوئی ایسا رویہ محسوس ہوا، کہ جس سے ہمیں یہ احساس ہوتا، کہ یہ ہم اُن کے لئے بوجھ بن رہے ہیں، تایا جی میرے MES راولپنڈی میں ہیڈ کلرک تھے، اور اپنے چھ بھائیوں میں سے میرے تایا جی اور میرے والد صاحب دو بھائی تھے، جنھوں نے میٹرک پاس کر رکھا تھا، میرے والد صاحب ڈاک خانہ میں ملازم تھے اور وہ انسپکٹر ڈاک خانہ جات سمندری (لائل پور) Posted تھے، مگر پھر اچانک اُن کی ٹرانسفر راولپنڈی زون میں کردی گئی، اور یہاں پر اُنھیں وہ Seniority نہ ملی جو کہ وہ Carry کر رہے تھے، کیونکہ سرکاری اداروں کا یہ اصول ہے کہ جب بھی کوئی ملازم کسی ایک زون سے دوسرے زون میں ٹرانسفر ہوتو اُس کی Seniority جو ہے وہ ختم ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے نئے زون میں Most Junior ترین Seniority لسٹ میں سمجھا جاتا ہے، اس بنا پر میرے والد کو یہاں انسپکٹر ڈاک خانہ جات تو نہ لگایا گیا، بلکہ ہیڈ کلرک کی سیٹ دے دی گئی، جس پر میرے والد کچھ خوش نہیں تھے، مگر بادل نہ خواستہ نوکری کیا اور نخرہ کیا، اُنھیں یہ ہیڈ کلر کی قبول کرنا پڑی، ہم تقریباً 15 دن اپنے تایا جی کے گھر میں رہے، کیونکہ تایا جی کا گھر بھی کرائے کا گھر تھا، اور وہ کرائے پر رہا کرتے تھے، لیکن اُنھوں نے اپنے آفس سے لون لے کر اپنا نیا گھر تقریباً تعمیر کرلیا ہوا تھا، اور اُنھوں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ تم فکر نہ کرو، ہم ہفتہ دس دن کے اندر شفٹ ہو جائیں گے، اپنے نئے گھر میں اور میں اپنے مالک مکان کو کہوں گا کہ یہ گھر تمھیں کرائے پر دے دے، ہم لوگ تقریباً 20 یا 22 دن اکٹھے رہے اسی اثنا میں میرے تایا جی نے اپنے نئے گھر شفٹ ہونے کے لئے تیاریاں شروع کردیں، اور پھر وہ شفٹ ہونے سے پہلے اپنے مالک مکان سے، میرے والد صاحب کو ملوایا، اُنھوں نے اور مالک مکان نے کہا جی کہ اکرم صاحب آپ میرے لئے بھائیوں جیسے ہیں اور آپ کا چھوٹا بھائی بھی میرے لئے بھائی ہے، مگر میری ایک گزارش ہے، کہ پہلے آپ کرایہ 60 روپے ماہانہ دیا کرتے تھے، اب میں آپ کے بھائی سے کرایہ 80 روپے ماہانہ کرایہ لیا کروں گا، پہلے میرے تایا جی کچھ ناراض ہوئے پھر اُنھیں کہا نہیں حاجی صاحب کچھ گنجائش کریں، مگر حاجی صاحب نے کہا کہ میں 100 روپے ماہانہ بھی کر سکتا تھا، کرایہ، مگر میں نے آپ سے جائز کرائے کا مطالبہ کیا ہے، اس پر میرے والد نے کہا کہ جی ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے، پھر کچھ دن کے بعد میرے تایا جی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئے، ہم لوگوں نے اپنا سامان جو سمندری سے لائے ہوئے تھے، وہ اپنے ایک عزیز کے گھر میں بند رکھا ہوا تھا، وہ لاکر اس گھر میں سجا دیا، اور پھر ہم ہنسی خوشی اس گھر میں رہنے لگ پڑے، اس گھر میں ہم لوگ 1965ء سے لے کر 1978ء تک رہے، اور ان 13 برسوں میں حاجی صاحب ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو آتے، بزرگ انسان تھے، بڑے پیار سے ہم لوگوں سے ملتے، اپنی ماں بیٹیوں جیسا پیار کرتے، اور اُن تیرہ برسوں میں ہم نے جو کرایہ 80 روپے ماہ پر طے ہوا تھا، وہ 1978ء میں بھی 80 روپے ہی رہا، یہ وہ حاجی صاحب کا بڑا پن تھا، کہ اُنھوں نے کبھی ہمیں تنگ نہیں کیا، ہمارے گھر کی سیڑھیاں جو چھت پر جایا کرتی تھیں، وہ پندرہ سیڑھیاں تھیں، اور میری عادت تھی، کہ جب میں اوپر چڑھتا، تو وہ میں سیڑھیاں گنتے ہوئے اوپر چڑھتا، سیڑھیوں پر ایک لکڑی کا دروزہ لگا ہوا تھا، جس پر ایک کنڈی تھی، اور رات کو ہم اُس میں تالہ لٹکا دیا کرتے تھے، اور حالانکہ ہمارا صحن کھلا تھا، اگر کسی نے آنا ہوتا، تو وہ صحن کے راستے بھی نیچے آسکتا تھا، مگر اُس وقت دور بڑا پرسکون تھا، چوری چکاری کا ڈر بہت کم تھا، آٹا دو روپے کلو تھا، چینی سوا روپے کلو تھی، گھی کا پانچ کلو کا ڈبہ دس روپے میں آتا تھا، سونا ایک سو بیس روپے تولہ تھا، چاندی ایک روپے تولہ تھی، چھوٹا گوشت سوا روپے پاؤ تھا، اور بڑا گوشت بارہ آنے پاؤ تھا، ہر طرف سکون تھا، اور کسی کو کسی قسم کی اس طرح کی بے چینی خوف زدگی، دہشت گردی، بھگ دڑ کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، اگر

سیاسی جلسے بھی ہوتے تو اُن دنوں بڑے پرامن اور پر سکون ہوا کرتے تھے، یہ 1965ء کی جنگ کے بعد کا دور تھا، جب ایوبی دور کے خلاف ایک عوامی تحریک زور پکڑ رہی تھی، شروع میں ہمیں اس گلی میں رہتے ہوئے کچھ مشکلات پیش آئیں، کیونکہ ہمارے اردگرد کے جو ہمسائے تھے، ہمارا اُن کے ساتھ اتنی سلام دُعا ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، مگر ہمارے گھر کے بلکل سامنے ایک گھر کیانی فیملی کا تھا، وہ تین بھائی اکٹھے رہا کرتے تھے، وہ گھر تین منزلہ گھر تھا، وہ اور وہ اس گلی کے، جہاں ہم رہتے تھے، اُس کے بدمعاش مانے جاتے تھے، اُن کا سب سے بڑا بھائی صادق تھے، اُس کے بعد یوسف اور پھر سب سے چھوٹا بھائی اکرم تھے، صادق کو ہم تایا جی کہا کرتے تھے، اُن کی بیوی فوت ہو چکی تھی، اُن کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے، اسی طرف یوسف چاچے کے دو بیٹیاں دو بیٹے تھے، اور چاچی کلثوم اُن کی بیوی تھی، اور اکرم چاچا جو تھا، وہ اُن دونوں بھائیوں میں سب سے زیادہ اکھڑ لاڈلہ اور غصیلہ تھا، وہ محلے میں ذرا ذرا سی بات پر پستول نکال لیا کرتا تھا، اور بڑی غلیظ قسم کی گالیاں بھی نکالا کرتا تھا، اُس نے اپنی گلی ہی کی ایک لڑکی سے پسند کی شادی کر رکھی تھی، اور ہم اُس کی بیوی کو چاچی صفیہ کے نام سے جانتے تھے اکرم چاچے کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ٹیپو تھا، جب 1978ء کے بعد ہم لوگوں نے اپنا گھر جو کہ 1965ء میں 80 روپے ماہانہ کرائے پر لیا تھا، تو 1978ء میں حاجی صاحب ہمارے گھر آئے اور اُنھوں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ بھائی جی میں یہ مکان بیچنے جا رہا ہوں، اگر آپ اس کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، تو مجھے 20000 روپیہ دے دیجئے، یہ گھر میں آپ کے نام رجسٹری کروا دیتا ہوں، مگر میرے والد کی اتنی تنخواہ نہیں تھی، وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ ہم نے پوری زندگی اپنے گھر کے لئے جو بھی چیز خریدی وہ قسطوں پر خریدی بھلے وہ PEY کا ریڈیو سیٹ ہو، SANYO کا ٹی وی سیٹ ہو، SINGER کی فریج ہو، یا میری ماں کی سونے کی چار چوڑیاں ہوں، یہ ہم نے سب کچھ قسطوں پر ہی خریدا، حانکہ ہم نے SINGER کی سلائی مشین بھی قسطوں پر ہی خریدی، ہم بھلا کیسے ایک دم سے 20000 روپیہ ادا کر سکتے تھے، میرے والد صاحب نے حاجی صاحب سے معذرت چاہی اور کہا حاجی صاحب نہیں یہ میرے بس میں نہیں ہے، تیرہ برس سے رہتے ہوئے گلی نمبر 10 میں ہمیں ہر کوئی جانتا تھا، اور یہ گلی اتنی لمبی تھی، کہ اس کے ایک طرف 25 سے 30 مکان آتے، اور تقریباً 10 فٹ کی گلی تھی بیچ میں اور دونوں طرف نالیاں تھیں، نکاسی آب کے لئے، اور پھر دوسری طرف بھی 20 سے 25 مکانات تھے، یعنی پوری گلی میں 50 سے 60 مکانات تھے، جن میں کچھ سنگل تھے، کچھ ڈبل سٹوری تھے، اور جب 1978ء میں جب ہم نے گلی نمبر 10 سے مکان نمبر BB-538 خالی کیا، تو نہ صرف ہماری آنکھوں میں آنسو تھے، بلکہ ہمارے تین چار قریبی ہمسائے جو تھے، وہ سب رو رہے تھے، تایا صادق کا بیٹا پپو میرا دوست تھا، اور میرا ہم عمر بھی تھا، اُس کے بڑا بھائی سعید کے پاس ویسپہ سکوٹر ہوا کرتا تھا، اور اُس کی دکان، موچی بازار، نزد سبزی منڈی کے قریب ہوا کرتی تھی، جب کے چچا یوسف کا بیٹا لطیف وہ بھی میرا ہم عمر ہی تھا، اور چچا یوسف کا شوروم گاڑیوں کا تھا، جو کہ بینک روڈ صدر میں واقع تھا، اور یہ فیملی بڑی خوش حال اور پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی، آج تقریباً دس برس کے بعد جب میں 1988ء میں گلی نمبر 10 میں داخل ہوا، تو میری خواہش تھی، کہ میں سب سے پہلے اپنا وہ گھر دیکھوں، جہاں میں نے زندگی کے 13 برس گزارے تھے، جب میں اپنے گھر کے سامنے پہنچا، تو اُس کا نقشہ ہی تبدیل ہو چکا تھا، وہ پکا سیمنٹ کا ڈبل سٹوری گھر بن چکا تھا، ہاں صرف تایا صادق کا گھر، ویسے کا ویسا ہی مضبوط تھا، اور پکا، میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی اندر سے، چاچے اکرم کی بیوی چاچی صفیہ آئی، اور اُس نے مجھے پہنچان لیا، کہنے لگی ولید، اندر آ جاؤ بیٹا، وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں، اور مجھے چار پائی پر بیٹھایا، گھر میں ایک پر اسراری اُداسی، اور خاموشی کا عالم مجھے محسوس ہو رہا تھا، اور میرے اندر آہستہ آہستہ گھبراہٹ اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، میں نے جلدی سے پوچھا، تایا صادق دُکان پر ہیں، تو چاچی نے کہا نہیں اُنھیں تو فوت ہوئے چار سال ہو گئے، میں نے پوچھا، زبیدہ آپا کہاں ہیں، کہنی لگیں اُسے بھی فوت ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں، میں نے پوچھا، سعید بھائی کیا کر رہے ہیں، کہنے لگے وہ بھی فوت ہو گیا ہے، کہنے لگیں اُسے جگر کا کینسر ہو گیا تھا، میرے اوپر یہ باتیں سُن کر ایک عجیب قسم کی خوف زدگی، ڈپریشن بڑھتا جا رہا تھا، میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، یوسف چاچا جی تو شوروم تو چل رہا ہے نہ دُکان تو اُنھوں نے کہا، ہاں وہاں پر لطیف بیٹھتا ہے، جسے ہم پیار سے طیفہ کیا کرتے تھے، مگر یوسف فوت ہو چکے ہیں، میں نے کہا چاچی کلثوم تو چاچی صفیہ نے کہا، کہ چاچے یوسف نے اپنی زندگی میں اُسے طلاق دے دی تھی، اور وہ اپنے بھائیوں کے پاس رہتی ہے، میں نے پوچھا پپو کہا ہے، اُنھوں نے کہا، اُس کو فالج ہو گیا تھا، اور وہ بھی پچھلے برس فوت ہو گئے تھے، یقین مانئے میرے اندر اتنی دہشت خوف زدگی، بڑھ گئی کہ میرا جسم کانپنے لگ پڑا، میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، میرا رنگ سُرخ ہو گیا، میں بمشکل چار پائی سے اُٹھا اور اپنے آپ کو اکٹھا کرتے ہوئے، کیانی منزل کے دروازے سے باہر نکل آیا، اور نکلتے نکلتے میں نے چاچی صفیہ سے پوچھا، چاچا اکرم ٹھیک ہیں نہ، اُنھوں نے کہا ہاں ٹھیک تو ہیں مگر، اُنھیں شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے دمہ ہو چکا ہے، اور زیادہ تر وہ گھر میں ہی رہتے ہیں، میں پھر جلدی جلدی وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی اور کہتی رہیں کہ ولید چائے پی کر جاؤ، کھانا کھا کر جاؤ، اتنے عرصے بعد آئے ہو، تھوڑی دیر بیٹھو تو صحیح، مگر میں اتنی، درد ناک صورتحال دیکھ سُن کر یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا اور اپنے آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے، گلی نمبر 10 سے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا، کہ مجھے ڈر تھا، کہ کہیں مجھے بھی موت نہ آ جائے۔

✣✣✣

غلام زادے

پروفیسر نور کمال شاہ/

"لو جی! آ گئے ہمارے افسر صاحب....." قاسم نے بلند آواز سے کہا تو اس کے پاس کھڑے جوان فوراً" میری طرف دیکھنے لگے- ساتھ ہی زور کا قہقہہ اٹھ پڑا اور میرے چہرے سے سرخی جیسے غائب ہوگئی اور رنگت زرد پڑ گئی-

اس دفعہ لگنے والے قہقہے پہلے سے زیادہ بلند تھے - قاسم، یونس، زبیر اور ان کے تین دوسرے ساتھی جی کھول کے ہنس رہے تھے- قاسم نے تو زیادہ ہنسنے کی وجہ سے اب باقاعدہ پیٹ پکڑ رکھا تھا اور میں سر نیچے کئے ان کی قہقہوں کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا- رنگت زرد اور پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے جمع ہو چکے تھے- کاش کسی طرح یہاں سے نکل جاوں مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا - حواس باختہ صورت میں میدان چھوڑ کر وہاں سے نکل آنا ہی غنیمت تھا؛ سو خود کو غموں اور پریشانیوں کے چادر میں لپیٹ کر میں وہاں سے نکل آیا - دور تک ان کے قہقہے میرا پیچھا کرتے رہے-

سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے سناوں....!!؟

-اپنی داستان کا آغاز کہاں سے کروں-....؟

اس وقت سے جب میں نے ایک کچی سی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں آنکھ کھولی تھی، اور پیدا ہو کر پہلے ہی سے ناداری کے چکی میں پسنے والے والدین کی مشکلات اور پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا.-؟

یا اس وقت سے جب مقابلے کا اعلی! امتحان پاس کر کے مجھے سرکار کے ہاں اونچے گریڈ کی نوکری ملی تھی اور تنخواہ لگ گئی تھی-.....!!

اس وقت سے شروع کرنا بھی شائد مناسب ہوگا جب گل دین نے میرے والد کے جنازے کے سرہانے کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ یہ تمہارے دوست مولوی اگر جنازہ پڑھائیں گے تو محلے کا کوئی بندہ یہ جنازہ نہیں پڑھے گا - ہم سب واپس چلے جائیں گے- پھر خود ہی جنازہ پڑھنا اور اپنے مردے کو سنبھالنا-----!!!"

سیانے کہتے ہیں غربت ہی انسان کا سب سے بڑا عارضہ ہے - اور یہی تمام برائیوں کی جڑ ہے - غربت اور ناداری اپنے ساتھ بھوک، بے بسی، مجبوری اور بے غیرتی لے کر آتی ہے --!! مگر میں کہتا ہوں، نہیں---!! غربت نہیں بلکہ ادنی! معمولی اور کمزور خاندان میں پیدا ہونا ہی سب سے بڑی ذلالت ہے- بھوک اور افلاس سے تو فقط جسم ہی متاثر ہوتا ہے- مگر ادنی! اور کمزور خاندان کے بے بس بندے بزدلی اور کمزوری کی علامت ہوتے ہیں- یہ بزدلی جسم پر وار نہیں کرتی بلکہ سیدھا روح کو گھائل کرتی ہے اور روح کی اذیت ناقابل برداشت ہوتی ہے - یہ ذلالت انسان سے اس کا اعتماد، حوصلہ اور ہمت چھین لیتی ہے---!!!

جس خاندان اور جس قسم کے حالات میں، میں نے جنم لیا تھا اس میں پرسکون اور پرآسائش زندگی کے خواب دیکھنا اندھے کو چراغ دکھانے کے مترادف تھا - مگر پھر بھی میں نے خواب دیکھے؛ پرآسائش زندگی کے؛ بڑا آدمی بننے کے اور خود مختار زندگی گزارنے کے - یہ وہ زمانہ تھا جب ہم نئے نئے آزاد ہوئے تھے- جبر، استحصال اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر ایک آزاد اور خود مختار وطن میں سانسیں لے رہے تھے - یہی وقت تھا جب ہمیں اپنی آزادی و خودمختاری کے ساتھ ساتھ مضبوط مذہبی بندھنوں اور روایات کو بھی مستحکم کرنا تھا- نئے آزاد ملک میں اس طرح کا آغاز ضروری تھا کیوں کہ آخر کار یہی نام استعمال کر کے تو ہم غلامی کو لات مار کر آئے تھے- ہم نے اپنے عوام کو آزادی اور غلامی کا فرق عملی طور پر دکھا کر ثابت کرنا تھا اور ساتھ ہی عالمی برادری کو عدل و انصاف پر مبنی پرسکون اسلامی معاشرے کی عملی تصویر بھی دکھانی تھی-

میں نے ایک ایسے خاندان میں جنم لیا تھا جہاں ہم ذرے ذرے کو محتاج تھے- ضروریات ہی پورے ہونا ممکن نہ تھا - ایسے گھروں میں والدین کی جو فطری خواہش ہوتی ہے کہ بیٹا تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بن جائے تاکہ کم از کم اتنی کٹھن مشکل زندگی گزارنے سے بچ سکے جیسے وہ خود گزارتے آئے ہیں- بالکل یہی خواہش مجھ سے بھی وابستہ کی گئی اور سکول کی عمر کو پہنچتے ہی مجھے سکول میں بٹھایا گیا- ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ایسے گھروں کے بچے کبھی خوبصورت پیدا نہیں ہوتے بس ایویں ہی گزارا حال سے- میرا بھی یہی حال تھا- ہاں ذہنی لحاظ سے میں کافی زرخیز تھا- حافظے کی نعمت مجھے بے مثال ملی تھی اور اسی بل بوتے پر اساتذہ بھی شفقت اور مہربانی پر مجبور تھے- گزارا حال شکل وصورت اور اس پر پھٹے پرانے جوتے اور پرانا بد نما یونیفارم جس کی اصل رنگت اڑ چکی تھی، شخصیت میں خاک نکھار لا سکتا ہے مگر اس خستہ حالی میں بھی، میں استاد کے سامنے ارسطو کی صورت موجود تھا جو ایک ہی بار استاد محترم سے پڑھ کر سیکھ جاتا تھا اور باقی سارا پیریڈ کند ذہن بچوں کے سامنے طوطے کی طرح مسلسل بول کر انہیں وہی پڑھا ہوا رٹوانے کی کوشش میں لگا رہتا-

وہ زمانہ شائد ہمدردی اور کسی کی مدد کا نہیں تھا سو میں بھی ان انعامات سے محروم ہی رہا- ذہانت نے

تھوڑی بہت لاج تو رکھ لی تھی البتہ وہ ٹوٹے پھوٹے جوتوں، خستہ لباس اور بھوک سے نڈھال صورت کی کمی پوری نہ کر سکا - میرے لباس کا مذاق ضرور اڑتا - ماں جی ملیشیا کے سیاہ رنگ کے کپڑے دھوتی اور اسے گھر میں موجود پرانی، انگاروں سے گرم ہونے والی استری سے ہموار کرنے کی کوشش کرتی - سفیدی مائل سیاہ کپڑے راکھ گرنے سے اور سفید بنتے اور مزید بدنما لگتے - اور پھر ان کا مذاق ضرور اڑتا - اساتذہ بھی خود کو روک نہ پاتے - مارننگ اسمبلی میں سینکڑوں لڑکوں کے موجودگی میں مجھے سامنے لا کر یونیفارم کی ہنسی اڑائی جاتی اور میں بے بسی سے اپنی عزت کا جنازہ اٹھتے دیکھتا رہتا - کسی نے یہ جاننے کی کوشش تک نہیں کی کہ یونیفارم پرانا اور بدنما کیوں ہے - بہر حال ان سب کے باوجود اول میں ہی رہا - نہ صرف تعلیم کے میدان میں بلکہ عملی میدان میں بھی - ادھر ادھر سے مانگی پھٹی پرانی کتابوں کے ذریعے تعلیم مکمل کی - شاندار تعلیمی کیرئیر کے بعد جب میں پہلی بار مقابلے کے امتحان میں بیٹھا تو کمال کر بیٹھا - پہلی ہی کوشش میں معرکہ سر کر لیا اور نمایاں نمبروں سے امتحان پاس کر لیا - پورے گاؤں میں واہ واہ مچ گئی - میری مثالیں دی جانے لگیں - گاؤں کے بڑے اور کرتا دھرتا، اپنے نکموں کا موازنہ میرے ساتھ کروا کر ان کی جان کو آ گئے - زندگی میں پہلی بار میرا حسد سے سامنا ہو رہا تھا - اپنی اولاد کے پیچھے رہ جانے کا غم معمولی نہیں ہوتا - یہ غم سہنے کے لئے پہاڑ جتنے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے _ میرے گاؤں کے ان داتا یہ بوجھ نہ سہہ سکے - اپنے بچوں کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے، الٹا میرے دشمن بن بیٹھے _ وہ مجھے مار پیٹ تو نہیں سکتے تھے اور نہ ہی قتل کر سکتے تھے کہ اس طرح انہیں کیا ملتا مگر مجھے ذلیل و بے عزت کرنا اور میری عزت نفس کو مارنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا - وہ مالک تھے اور میری مثال غلام کی تھی - میں اپنے والدین کے ساتھ ان ہی کے دیئے ہوئے کچے سے مکان میں رہتا تھا - آنے جانے کے لئے ان ہی کے راستوں کو استعمال کرتا تھا - ان ہی محسنوں کی مسجد میں نماز پڑھتا اور غمی خوشی میں ان ہی کے حجرے کو استعمال کرتا تھا - ہمارے دیہاتوں میں گاؤں کے شاملات سے زمین مسجد اور حجرے کے لئے مختص کی جاتی ہے اور مشترکہ خرچے سے یہ عمارتیں بنائی جاتی ہیں - شاملات میں غریب غرباء کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اس لئے گاؤں کی سطح پر فیصلہ سازی میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے - ان بے گھر غرباء، جو فقیر نامہ کہلاتے ہیں، کا کام محض خدمت گزاری تک ہی محدود رکھا جاتا ہے - بہر حال افسر تو میں بن گیا؛ تنخواہ بھی اچھی ملنے لگی مگر محکمہ زیادہ اختیارات اور شان و شوکت والا نہیں تھا اس لئے گاؤں میں پوزیشن نہ بن سکی _ گاؤں کے نصف سے زیادہ لوگ مالک تھے - ان کے ذاتی گھر تھے اور ملکیتی زمینیں گاؤں کے اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں - باقی لوگ مزارع تھے اور ایک طرح سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے - مالکوں کے کھیت سنبھالنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ ہر طرح سے ان کے بے دام خادم تھے، اور ہر قسم کی خدمت ان ہی سے لی جاتی تھی - اپنی خود غرض اور بالا دستی کا ثبوت ان ملکان نے اس طرح دیا کہ اولین فرصت میں ان غلاموں کا قبرستان الگ کر دیا - بھلا مالک اور غلام ایک ہی خطہ زمین میں کس طرح دفن ہو سکتے تھے - مالک حقیقی نے تو بھی ان کے درمیان فرق روا رکھا تھا - کچھ نہ کچھ فرق مراتب کا لحاظ بھی رکھنا تھا - ان جنتیوں کے بیچ دوزخی غلاموں کو زمین میں گاڑنا کہاں کا انصاف تھا - مسجد و حجرے میں بھی ان ہی ملکان کی مرضی چلتی - کوئی ذرا سا لکیر سے ہٹتا یا ان کی مرضی و منشاء کے خلاف جاتا تو نہ صرف اسے حجرے سے نکال دیتے بلکہ اللہ کے گھر کے اندر ہی اسے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتے -

میری افسری کا پہلا نقصان یہ ہوا کہ گاؤں کے بڑے مجھ سے بیزار ہو گئے - بڑوں کی بیزاری کا مطلب تنہا ہونا تھا - وہ کسی ایسے بندے کو جو فقیر نامہ سے تعلق رکھتا ہو اور سر اٹھا کر جینے کی کوشش میں ہو، برداشت کرنے اور اس کی حیثیت تسلیم کرنے پر قطعا" آمادہ نہ تھے - انہیں سر جھکا کر جینے والے غلاموں کی ضرورت تھی مالکوں کی نہیں - گاؤں میں میرے جو چند دوست تھے ان سے بھی میری کامیابی ہضم نہ ہو سکی - اور آخر کیسے ہوتی ؟؟ میری ہی وجہ سے تو انہیں طعنے سننے پڑ رہے تھے؛ گھر والوں کی جھڑکیاں اور ملامتیں برداشت کرنی پڑ رہی تھیں - الغرض زندگی گزارنے اور سر اٹھا کر جینے کے لئے جس خود اعتمادی کی ضرورت تھی وہ مجھ میں پیدا ہی نہ ہو سکا - اپنی ضروریات کو محدود کر کے کچھ رقم پس انداز کی اور گھر بنانے کے لئے جگہ خرید لی - ساتھ ہی مکان بنانے میں جت گیا - تنخواہ میری اچھی تھی اور میں اب کہیں بہتر پوزیشن میں تھا - میرا ذاتی گھر بنانا بھی ان لوگوں کو بہت برا لگا کیوں کہ اب میں ان سے نظریں اٹھا کر بات کرنے لگا تھا؛ ان کی زیادتیوں پر کھل کر ان کی مخالفت کرنے لگا تھا - اب وہ میرے ہر کام میں روڑے اٹکانے لگے ؛ موقع بہ موقع مجھے میرے اوقات یاد دلانے لگے - میری پچھلی زندگی کے تکلیف دہ واقعات اور میری بدحالی کے حوالے دینے لگے - مقصد صرف اور صرف مجھے تنگ کرنا تھا - افسر کا لفظ میرے لئے طعنہ بن چکا تھا - وہ اس لفظ سے مجھے چھیڑتے اور میں احساس کمتری کے دلدل میں دھنستا چلا جاتا - مجھے اندازہ ہو

گیا تھا کہ میری اور میرے بچوں کی کامیابی کبھی بھی ان لوگوں سے ہضم نہیں ہوگی -ان چند شریروں کے شر سے بچنے اور کڑوے کسیلے فقروں سے بچنے کی خاطر میں زیادہ تر گھر پہ ہی رہتا - ڈیوٹی سے واپسی پر سیدھا گھر آتا اور باقی وقت اندر ہی گزارتا - معاف کرنا اور چھوڑنا تو انہوں نے پھر بھی نہیں تھا؛ باہر نکلتا تو آوازیں کستے، گھر میں بیٹھتا تو وہ مسجد اور حجرے میں نہ بیٹھنے کا بہانہ بنا کر گاؤں سے بے دخل کرنے کی دھمکیوں پر اتر آتے - بہر حال گوشہ نشینی کا فائدہ لے کر میں نے بچوں کو تیار کرنا شروع کر دیا - اور جلد ہی میرے بچے بھی کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھنے لگے - جس دن میرے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملا اور بیٹی سکالرشپ پر یونیورسٹی پہنچ گئی؛ لوگوں کے رہے سہے حوصلے بھی جواب دے گئے - یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس کا ان کے بچوں نے صرف خواب ہی دیکھا تھا - یہ اذیت ان کے لئے ناقابل برداشت تھی - اب وہ کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئے -

امیدیں حوصلہ ہار گئیں، ضبط کے بند ٹوٹ گئے - آخر کب تک میں اپنی ہمتوں کو مجتمع رکھ سکتا تھا - میں تھک چکا تھا اور شائد ہار بھی چکا تھا - قصبے کو چھوڑنے کا فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا مگر میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا - شہر میں ایک مناسب سا مکان ڈھونڈ کر وہاں منتقل ہونے کی تاریخ تک مقرر کر لی - یہ کام میں نے کافی عجلت میں کیا - جب ہجرت کرنی ہی تھی تو پھر پس و پیش کیسا.... !! گاؤں میں کون سی اپنی جڑیں اتنی مظبوط تھیں؛ ہمیں تو گرنے کے لئے بس ہوا کے ہلکے سے جھونکے کا انتظار تھا -

مقررہ دن سامان اٹھانے والی گاڑیاں ہماری گلی میں پہنچ چکی تھیں؛ ان پر گھر کا سامان لادنے لگے - محلے والے اور اپنے قصبے کے باسی، جن کے رفاقت میں چالیس پچاس سال کا طویل عرصہ گزارا تھا؛ تماشہ دیکھتے ہوئے آگے سے گزرنے لگے - اس وقت بھی ان کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں - ہمدردی کے دو بول بھی مجھے سننے نصیب نہیں ہوئے - سامان لادنے کے بعد ہم بھی گاڑی میں بیٹھے اور بے نشاں قافلہ اپنی انجانی منزل کی طرف بڑھنے لگا - قصبے سے چند فرلانگ باہر سڑک کے کنارے ہائی سکول کی عمارت تھی - وہاں شائد جشن آزادی کا کوئی پروگرام ہو رہا تھا - گیٹ کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا اور خاص مہمانوں کی گاڑیاں بھی ایک طرف کھڑی تھیں - سکول کی عمارت کو چھوٹی بڑی قومی پرچموں سے سجایا گیا تھا - جس وقت ہماری گاڑی سکول کے مین گیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھی؛ لاؤڈ سپیکر پر ایک مقرر کی آواز گونج رہی تھی - شائد مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے اور ان کی گرجدار آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی......

"یہ موقع اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتا بلکہ اس کے لئے بے انتہا قربانیاں دینی پڑتی ہیں - یہ وطن ہمارے بزرگوں نے تن من اور دھن کی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے - یہ وطن ہمارے پاس اللہ کا بہت بڑا انعام ہے اور ہمیں اس نعمت کی ہر حال میں قدر کرنی ہے - آزادی کی قدر وہ لوگ جانتے ہیں جو اس عذاب سے گزر چکے ہیں - آج اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے - اب ہم کسی کے غلام نہیں ہیں - آج ہم اپنی مرضی و منشا کے مطابق آزادی سے زندگی گزار رہے ہیں، کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں، کسی کا ڈر نہیں - اللہ ہماری آزادی، خودمختاری اور سالمیت کو ہمیشہ برقرار رکھے، آمین" -

اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا------!!!

غزلیں/ عدنان خالد، لاہور

کار آمد ہے کاری جیسی ہوتی ہے
آسانی، دشواری جیسی ہوتی ہے

بدبختی کو بھی خوش بختی سمجھا کر
کیونکہ یہ خودداری جیسی ہوتی ہے

یہ باہر سے اندر تک خاموشی
سچ پوچھو تو آری جیسی ہوتی ہے

اچھی تو لگتی ہے مجھ کو اچھائی
لیکن یہ بیماری جیسی ہوتی ہے

تم کاہے کو مجھ سے میرا پوچھو گے
پوچھو تو بیزاری جیسی ہوتی ہے

....

درست دیکھ رہے تھے غلط بتا رہے تھے
جو لوگ تیرے مقابل کسی کو لا رہے تھے

میں وہ شجر کہ مری شاخیں سوکھنے سے قبل
پرندے جس کی محبت میں مبتلا رہے تھے

نہ رات دن میں ڈھلی اور نہ دن میں چاند اُبھرا
ہم آزمائے ہوؤں کو جو آزما رہے تھے

بڑھاپے آتے ہی تبدیل ہو گئے منظر
جو ناز اُٹھاتے تھے وہ لوگ غم اُٹھا رہے تھے

ہزار بار بھی ٹوٹا تو پھر سے جوڑ لیا
کسی سے رشتہ تعلق کا یوں نبھا رہے تھے

خوش نصیب

سعدیہ مرزا/میاں چنوں

ابا نے آنکھیں موندلی تھی ہمیشہ کے لئے۔ کبھی نہ کھلنے کے لئے یہ ان کی زندگی کا آخری دن سب کی نظریں مجھ پر ٹکی تھی میں ہر وقت اداس رہتا تھا واحد سہارا تھا جو اپنی یتیم بہن کے آنسو جذب کرسکتا تھا اپنی بیوہ ماں کے دکھ کو بانٹ سکتا اس گھر کا سائباں اب اکیلا تھا میں رونے لگا تو رشتے کے تایا یا چچا نے کہا:

''بیٹا بس......روتے نہیں مرد۔''

کوئی دوست بولا

''یار تم مرد ہو کر روؤ گے تو تمہارے گھر والوں کو حوصلہ کون دے گا؟''

بس یہ مرد کا طوق گلے میں لٹکائے میں دنیا میں آیا تھا اور شادیانے بج رہے تھے آج سے پچیس سال قبل میری پیدائش کا جشن منایا گیا تھا۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں تھی۔ بہن کے بعد پیدا ہوا تھا تو خوشی دیدنی تھی۔

سب میرے ناز اٹھاتے۔ خاندان بھر کا لاڈلا تھا۔

شیر......جوان......شاہزادہ......بادشاہ

نجانے کیا کیا القابات سے نوازا جاتا۔ گویا تلی کا چھالا تھا میں۔

میں گر جاتا چوٹ لگ جاتی سب مجھے لیے لئے پھرتے۔

بہادر بیٹا ہے بھائی......

بہادری کا یہ نشانِ حیدر پیدائش سے میرے ساتھ تھا۔ گویا تمیں مار خان تھا میں۔ وقت گزرتا گیا میں کالج جانے لگا۔

افسر بنے گا......ترقی کرے گا بیٹا......

یہ سب قصیدے مجھے سننے کو ملتے۔ میں حیران ہوتا کہ یہ سب میری بہن کو کیوں نہیں سننے کو ملتا۔ بہر حال یہ تمام تمغے کاندھے پر لٹکائے رکھتا۔ میں مومنہ کو حسرت سے دیکھتا تھا۔ جسے کوئی بھی نہ کہتا......

بہادر ہے تو افسر بنے گی تو یہ کرے گی وہ کرے گی۔

وہ کتنے سکون سے آرام کرتی تھی جب اماں ابا سے ڈانٹ پڑتی تو کتنے سکون سے رو لیتی وہ کتنی آزاد تھی۔ اور میں......کتنا مجبور......

میں شیر بہادر تھا خاندان کی نظر میں۔ مگر مجھے اپنا آپ گیدڑ لگتا۔ جو دنیا والوں کے القابات اور رواجوں کی پاسداری کے لئے دنیا میں آیا تھا پر مجھے ہر حال میں شیر اور افسر بن کے دکھانا تھا۔ مومنہ فیل بھی ہو جاتی تو کوئی اتنی فکر نہ کرتا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب مومنہ انٹر میں فیل ہوئی تو اسے ابا نے بیاہ دیا مجھے اس پر رشک آنے لگا وہ کتنے مہنگے لباس اور قیمتی زیور پہن کر نعمان بھائی کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

کتنی خوش قسمت ہے وہ اور اماں ابا یوں ہی دعا مانگتے رہتے تھے کہ اللہ اس کی قسمت اچھی کرے اس کی قسمت کتنی اچھی تھی کم از کم مجھ سے تو اچھی تھی تب تو مجھے جھرجھری آگئی جب میں نے زیور پر کمنٹ کیا تھا کہ وہ تو سکھی رہے گی جب اتنا زیور پہن کر خرچہ کرا گئی۔

اماں جواب میں بولی:

''جب تو افسر بنے گا نا تیری تنخواہ سے میں اس سے بھی دو گنا زیور ڈالوں گی اپنی بہو کو......''

لو بتاؤ ایک اور نشانِ حیدر لٹکانا تھا مجھے اب بہت سارے زیور بہو کے گلے میں لٹکانے کا۔ مجھے نعمان بھائی پہ ترس آتا جو مومنہ کے تمام لاڈ چاؤ اٹھاتے۔ دن بھر محنت کرتے اور ان کی محنت کی کمائی مومنہ گھر بیٹھ کر اڑاتی تھی۔

❁❁❁

میری زندگی کا موڑ طے ہوا اور میں افسر بھی بن گیا۔ نہایت محنت کی میں نے راتوں جاگا فجر میں اٹھ اٹھ کے پڑھا۔

نفل پڑھ پڑھ کے دعائیں کیں اور پھر افسر بھی بن گیا اب ایک اور ذمہ داری آن پڑی صبح سویرے دفتر جاتا شام ڈھلے گھر آتا پہلی تنخواہ میں نے امی کو سونے کی بالیاں ڈلوا دیں اور ابا کو کپڑے۔ پیچھے جیب خرچ نکال کے کوئی دو ہزار بچا۔

جسے اپنے اوپر خرچ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا تو سنبھال دیا ابھی زیور کا بوجھ بھی تو اتارنا تھا۔

اف......

نشانِ حیدر بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ زیور کا بوجھ اترا تو بری کا بوجھ۔

یعنی تمغہ تب جب تک نہیں سجے گا جب تک بری اعلیٰ پائے کی تیار نہ ہوگی۔ دن میں آفس کا کام تھکا دیتا۔ اور رات سوچوں کی وجہ سے گُل ہو جاتی بہت تلاش کرتا میں مطلب اپنے بہادر اور خوش نصیب ہونے کا مگر مجھے کسی لغت میں نہیں ملتا۔

مومنہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ نعمان بھائی بیچارے کتنا خرچہ اٹھایا تھا اس کا۔ مومنہ آرام سے مہینہ بستر سے لگی رہی تھی وہ کتنی خوش نصیب تھی سب اس کا منہ چومتے۔

ماشاءاللہ بیٹا پیدا ہوا ہے......

اور مجھے اس بیٹے پر ترس آتا تھا جو اپنے لئے شہزادے کا لقب سنتا اور قلقاریاں مارتا وہ بے خبر تھا کہ اس دھرتی کا کتنا بوجھ اٹھانا ہے وہ خوش نصیب نہیں ہے۔

میں مومنہ کو دیکھتا اور سوچتا کاش میرا کوئی شوہر ہوتا جو مجھے کما کر کھلاتا میری قسمت میں دھکے نہ ہوتے تھے سکون سے گھر بیٹھا آٹے دال کا حساب، پانی و بجلی کا بل، گیس کا بل میری قسمت میں پائی پائی جوڑنا نہ لکھا ہوتا......

اور پھر میری کئی سالوں کی تنخواہ جوڑ کر ایک گھنٹے میں اماں جیولر کو دے آئیں کپڑے والوں کو دے آئی ں۔ تمام دکانداروں کی موج ہوگئی۔ زیور اور اتنا کچھ لیا میری شادی کیلئے لڑکی منتخب ہوگئی۔

❁❁❁

وہ میرے پہلو میں بیٹھی تھی تمام زیور اور لباس کے ہمراہ کتنی دیر میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے متعلق۔ اپنے متعلق کرنے کا حوصلہ ہی نہ تھا کہ کیا کہوں گا کہ میرا کتنا خرچ آیا ہے تمہیں بیاہ کے لانے پر۔ ابھی نئی دلہن تھی برا ہی نہ مان جائے۔

''میری منہ دکھائی نہیں دیں گے؟'' کتنی دیر بعد اس نے منہ کھولا۔

''ہاں......کیا......وہ کیا؟'' میں ٹپٹا گیا۔

مطلب کوئی سونے کی چیز جو دولہا دلہن کو منہ دکھائی میں دیتا ہے اس نے وضاحت کی۔ میرا دل کیا اس سے تمام زیورات چھین لوں اور پوچھوں کہ بی بی یہ سب تمہیں کس نے دلایا ہے؟ اب پیچھے منہ دکھائی کی کسر رہ گئی ہے کیا؟

مگر میں کسی گیدڑ کی مانند غصہ پی گیا۔ میں بہادر تھا؟ ابا تو کہتے تھے......

وقت گزرتا گیا گھر کا خرچ اور بڑھ گیا تھا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ محنت کرنے لگا تھا۔ ایک وقت آیا جب میں اپنا جیب خرچ بھی آدھا کر چکا تھا۔ دو وقت کا کھانا اور لباس کے علاوہ میری کوئی ضرورت نہ تھی۔

مرد ہونے اور خاندان چلانے کا ٹھیکیدار جو تھا۔

یوں ہی ایک روز دن بھر کی ٹینشن میں گھر آیا تو سین ہی اور تھا فریحہ سامان باندھے گھر سے جانے کو تھی۔ اماں اس کو ترلے واسطے کر رہی تھی۔ وجہ کیا تھی کہ میں نے اسے ناشتہ لیٹ بنانے پر ذرا سا ڈانٹ دیا تھا بھئی میں بھی تو انسان تھا مجھے دیر ہو رہی تھی۔

یہ واقعہ مجھے دن بھر کی ٹینشنز میں بھی یاد بھی نہ رہا تھا اور وہ......مان نہیں رہی تھی میں نے اسے نہ روکا تھا مجھے غصہ ہی بہت تھا ہر موڑ پر قربانی کا بکرا۔ مجھے جھکنا ہے ہر جگہ مجھے محنت کرنی ہے مرد تھا میں......مذاق تھا کیا میں اسے نہ روکا۔ اگر اتنا خرچہ کروا کے وہ میری ایک بات بھی نہیں سن سکتی تو جائے بھاڑ میں......

کچھ دن گزرے تو خاندان والوں نے جینا دوبھر کر دیا اماں ابا کی نصیحتیں اور میرا قصور......اور مومنہ کے بعد خوش نصیب فریحہ لگ رہی تھی مجھے جو قصوروار ہونے کے باوجود بے قصور لگ رہی تھی سب کو۔

سب کے اصرار پر مجھے اسے منا کر لانا ہی پڑا تھا۔ جب یہ خبر ملی کہ میں باپ بننے والا تھا۔ جتنی جدوجہد میں نے کر لی تھی جدوجہد یا سزا اگر مجھے لگتا تھا کہ یہ سزا ہی تھی مرد ہونے کی سزا...... میں دعائیں مانگتا رات دن......

اے اللہ مجھے بیٹی دینا جو سکون سے زندگی گزارے میری بیوی مجھے دیکھ کر حیران ہوتیں اور خفگی بھی دکھاتی جبکہ وہ خود عورت تھی۔

''اللہ تجھے پتر دے گا۔'' اماں ابا کی بات پر میرا دل دہل جاتا۔

کوئی شیر بہادر نہیں چاہئے تھا جو ساری زندگی اپنے مرد ہونے کے خوف میں آ کر برباد کر دیتا اور پھر......پھر مجھے لگا میں بھی خوش نصیب ہوں کہ اللہ نے دعا سن لی تھی میری۔ سب منہ بسورے ہوئے تھے مگر میں بہت خوش تھا۔

اصل شہزادی تو وہ تھی میں کہاں کا شہزادہ تھا میں تو غلام تھا غلام پورے گھر کا۔ وہ شہزادی تھی راج کرنے آئی تھی میں اسے چومتا۔ لوگوں کے منہ بند کرواتا جو آہ بھرتے اور کہتے کہ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے مقدر والی کرے۔ وہ خوش نصیب تھی۔

......مقدر لے کر آئی تھی۔ میرے جیسی بدنصیب نہ تھی......

❁❁❁

سفرنامہ ''اک ذرا کیمبرج تک''
کی مقبولیت کے بعد
معروف ادیب توصیف ایزدی کی
شگفتہ مضامین پر مشتمل کتاب
''یہ واقعہ بھی ہونا تھا''
نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع ہوگئی ہے
صفحات 224 قیمت: -/1100 روپے
ناشر: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4489310 / 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

شناسائی

مریم طاہرہ/فیصل آباد

زندگی میں بھی اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے دن تو لبادوں میں گزار سکتے ہیں لیکن رات آپ کو اپنے اصل کے ساتھ ہی گزارنی پڑتی ہے اور جب رات چھا جاتی ہے تو اس کے بعد حقیقی روشنی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے لیکن یہ میری قسمت کی کیسی طویل شب تیرہ ہے کے اندھیروں اجالوں کا بعد واضح ہو ہی نہیں رہا۔ میں نے سنا تھا کہ ہر انسان کی زندگی میں فیصلے کا دن ضرور آتا ہے لیکن کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ ایسا میرے ساتھ بھی ہوگا کیونکہ ہم سوچتے ہیں کہ حادثے تو صرف دوسروں کے لئے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی مات تسلیم کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن یہ چند کاغذات جو اس وقت میرے سامنے میز پر دھرے ہیں میری شکست کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

یادش بخیر! دل کے نہاں خانوں میں یادوں کا ایک کمرہ ہے قرنوں پہلے کی بھولی ہوئی راگنی کی دھن اور کچھ گمشدہ چہروں کے دھندلے سے عکس ہیں۔ یہ نقوش رفتگاں بہار کی ساعتوں کی شناخت بھی رکھتے ہیں اور انہیں کے ساتھ خزاں کی اداس شاموں اور خشک پتوں کے ڈھیر وابستہ ہیں۔ ان میں سب سے واضح اور گہرا عکس تمہاری یاد کا ہے۔ اس کمرے کے تالے اب قفل زدہ ہو چکے ہیں یوں لگتا ہے میں تمہاری یاد بھی کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں جو جو زندگی کے دشت میں میری رفیق رہی جس کی بدولت ویرانی سی ویرانی میں بھی میں نے جب چاہا اپنی مرضی کے دن، چہرے، ساعت اور یاد کے کسی مخصوص عکس سے اپنے تصورِ جاں کو آباد کر لیا۔ پر جب سے اس یاد کا بھی دامانِ خیال چھوٹنے لگا ہے میرا تخیل مردہ ہو گیا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ کمرہ اتنا کثافت زدہ نہ ہو جائے کہ میرے دھڑکن کی راہ میں رکاوٹ بن جائے بہر طور مجھے جینا ہے اور آپ کی زندگی کے چند منٹ میرا تریاق ہیں۔ سوموار 11 بجے آپ کے آفس میں آپ سے ملاقات رہے گی یاد رہے اس کے علاوہ میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔"

فرازے سعید

یہ وہ دوسرا خط ہے کہ جس نے میرے اعصاب مفلوج کر دیے ہیں میں مٹھیاں بھینچے خود سے یہ سوال کر رہا ہوں کیا آخر اب کیوں؟ ٹھہریے میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔

وہ بڑا خوبصورت اوائل بہار کا ایک چمکدار دن تھا جیسے کہ مخصوص گزرے ہوئے دن ایک بھرپور اثر انگیزی کے ساتھ یادوں کے باغیچے میں رہا کرتے ہیں ایسے ہی ایک دن حبیبہ الرحمٰن میری زندگی میں آئی تب میں کالج سے نیا نیا فارغ ہوا تھا۔ معاشی آسودگی تو نہ تھی لیکن ایک نئے لکھنے والے کی حیثیت سے محدود ادبی حلقوں میں میری شناخت ہو رہی تھی حبیبہ کے والد میرے خالو تھے اور بہت خوش حال تھے۔ میری قسمت اس لحاظ سے یقیناً بہت تیز نکلی کہ امیر اور بااثر آدمی کی بیٹی سے شادی نے جدوجہد کے اس دور میں مجھے بڑا سہارا دیا۔ میں نے زندگی میں تین کام بہت دلجمعی سے کیے اپنے اچھے مستقبل کے لیے محنت، اماں سے محبت اور اپنے باپ سے نفرت۔ ابا سے نفرت کی وجہ ان کی دوسری شادی اور ہماری غربت سے زیادہ اماں کی وہ محبت تھی جو انھیں حالات کے باوجود تادمِ آخر ابا سے رہی۔ اس وجہ سے مجھ میں ایک عجیب طرح کی شدت پسندی پیدا ہوتی چلی گئی مجھے تو کوئی پورے کا پورا چاہیے تھا شراکت کے بغیر محبت۔ تب میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کوئی ایسا دریچہ ہو صرف میرے لیے وا ہوتا ہو۔ جس نے میرے اندر یہ عزم پیدا کیا کہ اس بے رنگی سے بالآخر میں اپنے حصے کے رنگ کشید کروں گا۔ اور پھر اچانک حبیبہ آ گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں کبھی بھی اسے محبت نہ کر سکا لیکن اس کی بدولت جو معاشی آسودگی مجھے نصیب ہوئی اس نے مجھے زندگی کی دوڑ میں بھرپور طریقے سے شامل کر دیا۔

کالم نویسی کے ساتھ میں نے ادب کی باقی اصناف کی طرف بھی توجہ کی۔ میری تحریروں میں ہمیشہ افسانوی رنگ نمایاں رہا۔ زندگی کی جن تلخیوں نے میرے اندر بسیرا کیے رکھا میں نے ان کی رسائی کبھی اپنے نوکِ قلم تک نہ ہونے دی۔ میں نے زہر پیا اور محبت اُگلی۔ بھلا زہر سے کون متاثر ہوا کرتا ہے؟ حصار باندھنے کے لیے تو خواب چاہییں کچے ہی سہی، امیدیں ہوں جھوٹی ہی سہی۔ دلکش فریب زدہ لہجے جن کے مقدر میں برف ہو جانا لکھا ہوتا ہے، وقتی طور پر جکڑتے ضرور ہیں چاہے ان کا بھگتان ساری عمر بھگتنا پڑے۔ جتنا میرا اندر تلخ اور زہریلا تھا میرا قلم اتنا ہی مٹھاس بھرا تھا۔ پھر ارم اور حمزہ کی پیدائش کے بعد بظاہر کوئی تشنگی رہی بھی نہیں۔ لیکن حبیبہ کو کبھی میں نے اپنے اصل تک رسائی نہ ہونے دی۔ ہمارے درمیان حقوق و فرائض کی جنگ تو کبھی نہ ہوئی لیکن ایک ان دیکھی دیوار سدا حائل رہی۔ جیسا کہ ہر تخلیق کار کے اندر قدرتی طور پر قدرے غیر معمولی پن پایا جاتا ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے چاہے اس کی تحریر سے اور چاہے اس کی ذاتی زندگی سے۔ لیکن میری تحریر میں دن بدن جتنی پختگی آتی جا رہی ہے اندرونی طور پر وہ خود کو اتنا ہی خالی محسوس کرتا ہوں۔

اور اب مجھے شدت سے فرازے سعید یاد آنے لگی ہے، میں آج تک جان نہیں پایا کہ وہ کچھ بھی نہیں

ہے یا سب کچھ ہے۔

کالج کے آخری ایام کی بات ہے کہ مجھے ایک انجان خط موصول ہوا۔

یادش بخیر! انسان جتنی شدت محسوسات میں رکھتا ہے اگر اتنی قدرت بیان پر بھی ہو تو کیا کہنے۔ اپنی سی کوشش میں بھی کر رہی ہوں کل آپ کا افسانہ 'تمنا' نظر سے گزرا تو میرے لاشعور کے کسی گوشے سے چند لمحے سطح پر ابھر آئے صرف ایک دن کی ملاقات۔۔۔ ملاقات جتنی قلیل ہے اشتیاق اتنا ہی شدید۔ آپ سے بس ایک ہی بات کہنے کے لئے خط لکھا ہے محبتیں اور خواب صرف رقم مت کیجیے اپنائیے بھی۔ اگرچہ آپ نے بہت دبیز پردے ڈال رکھے ہیں لیکن یہ آپ کے قلم سے بالآخر چھلک پڑا ہے۔

فرازے سعید

میرے لیے فطری طور پر یہ ایک انتہائی چونکا دینے والا خط تھا کہ کس ملاقات کی بات ہوئی ہے اور کس نے میرے اندر اتنا گہرا غوطہ لگایا ہے۔

حبیبہ اور مجھ میں ایسی کیا دیوار تھی وہ میری روح کے ساتھی نہ بن پائی۔ یا میں میں نے ہی ایسا نہیں چاہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابتدا میں اس کی آنکھیں کیسے لو دیتی تھیں اور پھر میری وجہ سے ان چراغوں کی روشنی ماند پڑتی گئی جب وہ کوشش کے باوجود میری ذات کے قفل نہ توڑ سکی تو کسی احتجاج کے بغیر خاموش ہوگئی۔ میں نے خیال بھی نہیں کیا کہ جس اکلوتے دریچے کی میں نے تمنا کی تھی وہ حبیبہ بھی تو ہو سکتی تھی۔ ادھر مجھے فرازے کے خطوں کی عادت سی ہوگئی برسوں ہم اس بندھن میں بندھے رہے۔ اس نے مجھ پر ابتدا ہی سے واضح کر دیا کہ قلمی دوستی کے علاوہ وہ مجھے زندگی میں کوئی بھی جگہ دینے سے قاصر ہے۔ تب میرے لیے یہ اہم نہ تھا۔ اہم تو یہ تھا کہ میں پہلی بار کسی انسان سے ذہنی رسائی اور قلبی تعلق محسوس کر رہا تھا مجھے شدت سے اس کے خط کا انتظار رہنے لگا۔ غیر محسوس طور پر فرازے نام کے اس خیالی پیکر نے آکاش بیل کی طرح مجھے اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ حبیبہ کے ساتھ گریز کی وجہ بھی یہی بنا۔ کیونکہ میرے پاس ایک خوبصورت تخیل تھا۔ مجھے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ ساتھ رہنے والوں سے ذہنی مطابقت کتنی ضروری ہے اور یہ کوشش سے ہی پیدا کی جاتی ہے۔ جب میں خطوط کی ان بیساکھیوں کا عادی ہوگیا تو وہ چلی گئی ایک دم سے خطوط آنا بند ہو گئے۔ میں بہت عرصہ انتظار کرتا رہا اور پھر ہار کر طے شدہ وعدے کے مطابق خاموش ہوگیا۔

ہاں تو میں آپ کو حبیبہ کے بارے میں بتا رہا تھا مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ہم میں موجود دوری اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب اسے پاٹنا ممکن نہیں رہا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت خاموشی سے ہمارے ارد گرد جو وقوع پذیر ہو رہی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہجر بھی ایسی کوئی شے ہے۔ اس بھیڑ بھری زندگی میں، آتے جاتے دنوں میں، لوگوں سے ملنے جلنے میں، آہستہ روی سے یہ ایک خاص عمل کے تحت اپنی جڑیں گہری کر رہا ہوتا ہے اور پھر بہت عام سے دنوں میں کبھی آرام کرسی پر چائے پیتے ہوئے، روزمرہ کا کوئی بھی کام کرتے ہوئے ایک لمحہ خاص انکشاف کر جاتا ہے کہ زندگی سے کچھ بہت اہم جا چکا ہے۔ جدائی کا پہاڑ ایسے ہی مسلط ہو جاتا ہے۔ تب پتا چلتا ہے کہ دوری کی خلیج شمس وقمر کی مثل ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ کچھ بھی الوداع کہے بغیر، ہشیار باش کیے بغیر زندگی کی بھیڑ میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس لمحہ خاص کا انکشاف بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے جیسے سانپوں سے زیادہ پیچھے رہ جانے والی لکیریں ڈسا کرتی ہیں تو یہی انکشاف جدائی کی اصل ہے۔

فرازے کے بعد حبیبہ سے متعلق مجھے اس احساس سے شناسائی تب ہوئی جب ایک دن مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ایسے لگا جیسے حبیبہ کا مرکز نگاہ میں ہوں۔ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو وہ واقعی مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میرے دیکھنے پر بھی وہ بالکل متوجہ نہ ہوئی۔ شاید مجھے دیکھ کر بھی نہ دیکھ پا رہی تھی۔ آخر میں نے اسے پکارا "حبیبہ!" دوسری بار میں نے قدرے پریشان ہو کر زور سے پکارا تو وہ بری طرح سے چونکی۔ جیسے کسی گہرے خواب سے جاگی ہو اور کہنے لگی" آپ ناراض نہ ہوں میں گرم کرلاتی ہوں چائے۔"

میں اس کے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گیا کیونکہ اس وقت نہ تو چائے پی جا رہی تھی نہ ہی پہلے کوئی بات ہو رہی تھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی خاص ذہنی کیفیت میں تھی۔ اس خیال کی تائید کے لئے مجھے اور بھی کئی ثبوت ملنے لگے جن سے مجھے یقین ہوگیا کہ اس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ میں نے فوری طور پر اس کے علاج کی طرف توجہ کی۔

حبیبہ تھی، فرازے تھی، میں تھا یا صرف میں ہی تھا اور وہ دونوں ہی نہیں تھیں۔ فرازے ناقابل حصول تھی جس کی پرستش میں عمر گزری اور حبیبہ وہ لمحہ حاصل تھی جس کے حصول کو میں نے کبھی گنا ہی نہیں۔ جب فرازے نہیں تھی تو اس کا پرکیف غم تھا۔ غم کیا تھا ایک فسوں تھا۔ جیسے اچانک کہیں سے وارد ہوا ہو۔ پھر ٹپکے ہی گیا قطرہ قطرہ، بوند بوند۔ جس نے ایک نشے کی طرح مدتوں مجھے اپنا عادی رکھا۔ وجوہات کب کی معلوم ہوگئیں پر یہ اپنی بھرپور اثر انگیزی کے ساتھ میرے اندر ایستادہ رہا۔ میں عمر بھر مشکور رہا کہ یہ رکاوٹ ہی حرکت کا وسیلہ بنتی تھی۔ عین اس موقع پر جب میں مصنوعی قمقموں کی چندھیانے والی روشنیوں میں گھرا ہوتا تو مجھے زندگی کی تاریک درزیں اور بھی شدت سے دکھائی پڑتیں۔ چھم سے فرازے کا

تصورِ آن موجود ہوتا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کسی پرسکون گوشے میں لے جاتا قلم پکڑا کر غائب ہو جاتا اور تب ہی زندگی اپنی بھرپور خیال آرائی کے ساتھ میرے اندر انگڑائی لیتی۔ میرے قلم سے ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار نکلتے اور میں نے ہر گزرتے دن ایک زینہ اوپر بلندی کا سفر طے کیا۔

آہستہ آہستہ حبیبہ روبہ صحت ہونے لگی ڈاکٹرز کے نزدیک اگر ایک لمبے عرصے تک ذہنی جنگ اور نا آسودگی رہے تو برداشت ختم ہونے لگتی ہے۔ ہم سب حبیبہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بولے جو بھی اس کے دل میں ہے۔

ذات کا خول بہت پختہ
بے در بے روزن
اندر کی باتیں ہیں اندر
باہر کی اُس پار

اب عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان صرف عافیت چاہتا ہے اور سارے سوال جواب ، پرانے کھاتے ، سوچیں ، اور جذبات کی شدت خواب معلوم ہوتے ہیں۔ میں اندروا ندری اپنے ساتھ آڑا لگا لگا کر تھک گیا ہوں۔ نہ کوئی سوال ہے نہ کوئی عرض۔ میں تو یہ جواب بھی نہیں چاہتا کہ فرازے کون تھی؟ کیوں آئی؟ آ ہی گئی تھی تو کہاں گئی؟ اب تو بس برگد جیسی گھنی چھاؤں چاہتا ہوں۔ حبیبہ ہو میں ہوں مکمل گھر ہو۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا شاید اب میرے سارے تشنہ سوالوں کے جواب دینے تھے۔ سوموار آنے میں دو دن باقی ہیں اور میرے اعصاب مفلوج ہوئے جاتے ہیں۔ محسوس کرتا ہوں کہ کائنات کی ہر چیز ساکت ہے۔ ایسی وحشت کے جی چاہتا ہے چاہے زلزلہ آئے ، طوفان آئے ، کوئی عمارت گر جائے کچھ ہو جائے پر میرے اندر سے باہر کی کوئی مطابقت تو ٹھہرے۔ لوگوں کے خوش باش چہرے دیکھ کر سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کیا کسی کی زندگی میں کبھی کوئی فرازے سعید نہیں آئی یا لوگ فراموش کر کے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ اور ہنر رکھتے ہیں۔

برسوں بعد ہی سہی وہ دن آ گیا ہے کہ پردے اٹھ جائیں۔ وہ آنے ہی والی ہے میں نے خود کو کام میں ایسے منہمک کر لیا ہے جیسے مجھے کسی کا انتظار نہیں ٹھیک گیارہ بجے دروازہ کھلا اور وہ اندر آئی۔ درمیانی عمر کی ایک خوبصورت اور پر وقار عورت۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے زندگی میں کسی عورت کو حسین ہونے کے ساتھ اس قدر پر وقار اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

سلام کر کے وہ اپنی نشست سنبھال چکی تھی جیسے اس کی میرے ساتھ آفس سے بھی برسوں کی شناسائی ہو۔ شناسائی تو خیر تھی پر۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔ ایک عالم حیرانی میں اسے دیکھے جا رہا ہوں۔ شاید اسے خود ہی احساس ہو گیا ہے کہ میں کچھ بھی بول نہیں پاؤں گا اس نے بات شروع کی

کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟

ابھی تک آس کی چڑیا میرے اردگرد پھڑ پھڑا رہی ہے کہ اس کے اگلے جملے نے ایک جھٹکے میں اس کے پر کاٹ دیئے اور وہ دوبارہ بولی" میں چاہتی ہوں آپ میری کہانی لکھیں۔ میری یعنی فرازے سعید یا حبیبہ رحمان کی کہانی۔ ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس کو شکایت ہے کہ بیس سالہ رفاقت کے باوجود اس کی اپنے شوہر سے کبھی گفتگو نہیں رہی۔ ایک ہی چھت تلے زمانہ گزرنے کے باوجود وہ شناسا اجنبی ہیں۔ اور ان کی اس اجنبیت کا ثبوت یہ خطوط ہیں"۔ اتنا کہتے کہتے اس کا تنفس پھول گیا۔ وہ سانس لینے کو رکی اور پھر گویا ہوئی " باقی آپ اتنے اچھے قلمکار ہیں کہ مجھے توقع ہے اس کہانی کے سارے تانے بانے آپ خود بُن لیں گے۔

یہ کہہ کر وہ جیسے آئی ویسے ہی چلی گئی۔ حبیبہ جا چکی تھی اور مجھے آج سمجھ آیا ہے کہ یہ تھی کہ فرازے۔

میں نے آج سے پہلے ایسی ہزیمت کبھی محسوس نہیں کی قدرت نے ہر چیز میرے منہ پر دے ماری۔ حبیبہ نے اپنی چپ سے مجھے اپنے ضمیر کے کٹہرے میں لا کھڑا کر دیا۔

فرازے کون تھی اور کس چور دروازے سے آئی؟ آج پتہ چلا ہے کہ فرازے تو کسی کی زندگی کا بھی ایک کردار ہو سکتی ہے۔ ذات کی کسی ناتمامی سے متعلق جو اندھیرے دریچوں سے در آتی ہے۔ کوئی ادھورا قصہ یا کوئی پرانی یاد جو ہمیشہ پیچھا کرے۔ کبھی زہر تو کبھی مہر۔ بظاہر بہت مضبوط لوگ بھی خود کو اس بے نام بیساکھی کا عادی بنا لیتے ہیں۔ دنیا کے لئے ذات کا جو روزن مقفل رہتا ہے ہم وہ پوری آمادگی کے ساتھ فرازے کے لیے وا کر دیتے ہیں۔ اس خیالی پیکر اور بے نام رشتے نے مجھے خود سے تو باخبر رکھا لیکن اردگرد کے لوگوں سے اتنا ہی دور کر ڈالا۔ جو تصور جمال میں نے ہمیشہ کاغذ کے ٹکڑوں میں تلاشا کبھی حبیبہ میں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انسان بھی کیا شے ہے کہ ہر پل گزر رہا ہوتا ہے پھر بھی لمحہ گزراں کو پکڑنا چاہتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک وقت میں کتنے مختلف روپ کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے کسی کے لیے شعلہ تو کسی کے لیے شبنم۔ آج کوئی نہیں جس میں اپنے سوا مورد الزام ٹھہراؤں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ جب میں یہاں سے اٹھوں گا اور گھر جاؤں گا تو حبیبہ کو کیا صفائی پیش کروں گا۔ لیکن ٹھہریے اس سے پہلے میں آپ سے پوچھ لوں کہ کیا آپ کی زندگی میں کوئی فرازے تو نہیں؟

❁❁❁

سرگوشیاں

عادل سعید قریشی/فیصل آباد

میرا گاؤں مجھ سے اس وقت چھوٹا جب میں نے دسویں پاس کی تھی۔ میرا گاؤں اسلام آباد کی پچھلی انگلی ہے۔ اسلام آباد کے ساتھ بارہ کہو سے تھوڑا پہلے قریش پور نام کی بستی ہے۔ میں اسی بستی میں ایک چھوٹے سے زمیندار کے گھر پیدا ہوا۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ بختاور پھر متو ہے اور سب سے چھوٹا میں خادی، جو اپنے والد کی وفات سے چند ماہ بعد پیدا ہوا۔ وہ بہت کڑا وقت تھا میرے چچا دادن خان نے میری ماں کی سرپرستی کی حامی تو بھر لی لیکن چچا کو میری پیدائش کا خاصا قلق تھا، جس کا پتا بعد کے آنے والے واقعات سے چلتا گیا۔ بہرحال چچا اتنے برے انسان نہیں تھے لیکن جاگیر کے وارث یعنی میری پیدائش پر خفا ضرور تھے۔ دادا کی زمینیں انہی کے کار اختیار میں تھیں۔ ہر فصل پر وہ کچھ نہ کچھ بیوہ بھابھی کو دے ہی دیتے تھے جو ہر سے لحاظ سے کم ہی تھا مگر مرتے کیا نہ کرتے والا معاملہ تھا۔ میرے تین ماموں تھے لیکن چچا سے اس حوالے سے بات اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ چچا کا رسوخ اور رعب زیادہ تھا۔ ماں نے ایک آدھ بار بات کی تو چچا دادن بولے اپنی زمین لے لے اور خود بوائی کیا کر میں تو اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ ماں خود بوائی کا مطلب جانتی تھی۔ چپ ہو گئیں اور گزارا کرنے لگیں۔ پھر کچھ عرصے بعد ماں نے زمین بیچنے کا عندیہ دیا تو چچا جان نے نہ صرف خود خریدنے سے انکار کیا بلکہ انھوں نے کسی بھی اور خریدار کی ٹانگیں توڑنے کا اعلان بھی کر دیا۔ دوسری طرف ساری برادری کو بتا دیا کہ کوئی زمین کی خریداری کا خیال دل میں نہ لائے اور ان کے سامنے ہماری طرف داری کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ اس گاؤں میں چچا جان سے زیادہ زمین رکھنے والے کئی ملک تھے مگر وہ چچا دادن جتنے بڑے فسادی اور جھگڑالو نہیں تھے لہذا وہ سب خاموش رہے۔

وہ بہت کڑا وقت تھا۔ بیوہ ماں نے جب دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کو پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں کھلا سکتی تو زمین انھیں کیسے دلوا سکے گی تو اس نے ایک منصوبہ تیار کیا اور پھر نہایت اخلاص کے ساتھ اس منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ اللہ کا نام لے کر چل پڑی۔ بڑی بیٹی گورنمنٹ پرائمری کے سکول میں پڑھتی تھی۔ اب جب دوسری بیٹی کے داخل کرانے کی باری آئی تو اس نے اس کو ایک سال لیٹ کیا اور پھر سال بعد مجھے اور متو کو ایک ہی کلاس میں داخل کرا دیا ساتھ ہی بختاور کو بھی سرکاری سکول سے نکال لیا اور ہم تینوں کو دوسرے گاؤں میں ایک پرائیویٹ سکول میں جا داخل کرایا۔ خود اسلام آباد میں دو تین گھروں کے کام لے لیے۔ چچا نے برادری میں نیک نامی کے لیے سو روپے ماہوار میرا وظیفہ بھی لگا دیا تھا لیکن یہ رقم بھی خرچے کے لیے بہت کم تھی۔ اب ماں کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح سویرے ہم تینوں کو لے کر سکول جاتی جو پانچ کوس کے فاصلے پر تھا پھر وہاں سے وہ اپنے کام پر چلی جاتی۔ واپسی پر وہ ویگن سے ہمارے سکول آتی اور ہمیں لے کر وہاں سے پیدل گھر آ جاتی۔ راستے میں ایک زیارت آتی تھی وہاں رک کر ہم چاروں مل کے ماں کے لائے ہوئے سالن کے ساتھ روٹی کھاتے تھے۔ کبھی کبھی تازہ اور سفید آٹے کی روٹیاں ہوتی تھیں لیکن اکثر کالے آٹے کی اکڑی اور حلق کو خراشنے والی چپاتیاں ہوتی تھیں لیکن ہم خوب مزے لے لے کے سالن میں ڈوب ڈوب کھاتے تھے کیوں کہ خراش کی جلن تو شام میں کہیں حلق میں شروع ہوتی تھی، ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہم سالن کے ساتھ ڈبل روٹی کھاتے تھے۔ جس سلائس پر کائی اگی ہوتی ماں اس حصے کو نوچ نوچ پھینکتی اور باقی سلائس کھلا دیتی تھی۔ کڑوا مکھن، کڑوا مکھن بھی ہم کھاتے تھے، پتا ہے ماں کیا کہتی تھی، کہا کرتی تھی یہ کڑوا مکھن صحت کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے، صاحب لوگوں کو پتا نہیں ورنہ وہ ہم کام کرنے والیوں کو کبھی نہ دیں بلکہ اپنے بچوں کو کھلائیں۔ بختاور کا ماننا یہ تھا کہ اگر ہم سرکاری سکول میں ہوتے تو ہم کو یہ مزے مزے کی چیزیں کبھی بھی کھانے کو نہ ملتیں۔۔۔۔۔ بہرحال ماں خوش تھی کہ اس کی اولاد کی خوراک کی کمی دور ہوئی اور سب کی صحت اچھی ہوتی جا رہی ہے۔ بختاور تو گوری چٹی ہو گئی اور متو تو تھی ہی سانولی سی مگر اب وہ بھی روپ نکالنے لگی تھی۔ میرے پچکے گال بھی بھرنے لگے۔ چچا دادن نے اس صحت مندی کو اپنے سو روپے کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ ہمارے گھر میں کپڑوں اور خوراک کی ریل پیل ہو گئی، اترنوں کے آ جانے سے ہماری خوشحالی گاؤں میں چغلیاں کھانے لگی، اب برادری والوں کو تکلیف شروع ہوئی۔ پھر یہ ہوا کہ ہماری برادری کو ماں کے غیر لوگوں کے گھروں میں برتن دھونے اور کام کرنے پر اعتراض ہوا۔ ایک جرگہ ہمارے گھر آیا جس کو ماں کے بچوں کو مہنگے سکول میں پڑھانے اور غیروں کے گھروں میں کام کرنے پر شدید اعتراض تھا۔ ماں نے ان کو صاف جواب دیا کہ اس نے جو سوچا ہے اس سے وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے۔ بچوں کو پڑھاؤں گی اس کے لیے جو بھی کرنا پڑے گا کروں گی۔ چچا بھی اس جرگے میں تھے انھوں بھی خوب شور مچایا مگر ماں نے ایک نہ سنی۔ چچا نے سو روپے کا وظیفہ روک لینے کی دھمکی بھی دی اور یوں وہ جرگہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے واپس ہوا کہ اگر ماں نے غیروں کے گھروں میں اپنی برادری کی بے توقیری بند نہ کی تو برادری میں سے کوئی بھی ہم سے رشتہ تعلق نہ رکھے گا اور نہ ہم کو غمی خوشی میں بلایا جائے گا نہ ہمارے ہاں کوئی آئے گا اور ہمارا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ جرگہ لوٹ گیا اور ماں بختاور کے گلے لگ کے آواز بنا کے خوب روئی۔

ماں اکثر تو نہیں لیکن بختاور کے ساتھ دل کی بات کرتی تھی۔ان دونوں کو میں سرگوشیاں کرتے دیکھا کرتا تھا،ان سرگوشیوں کا خاتمہ رونے پر ہوتا تھا اور یہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے سینے سے لگ کر رو دیا کرتی تھیں تو مجھے بڑا ارمان لگتا تھا کہ کب میں بختو جتنا ہوں گا اور ماں مجھ سے بھی یوں راز و نیاز کرے گی اور پھر مجھ سے لپٹ کر رو بھی دیا کرے گی۔اس حوالے سے میں خود کو بختو سے کم تر محسوس کرتا تھا۔اس عمر میں مجھے بس ایسا محسوس ہوتا تھا۔مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے اس احساس کو کیسے ماں یا بختو تک پہنچا پاؤں۔بختو سے کیسے کہوں کہ وہ بختاور ہے کہ ماں اس سے دل کی کہتی ہے،ماں اس کو اپنے لفظ اور آنسو سونپتی ہے لیکن میرا دل ہمیشہ مجھے تسلی دیتا تھا کہ جب میں بھی بختاور کی طرح ''پنجم ج'' میں پہنچ جاؤں گا تو ماں میرے ساتھ بھی یوں ہی راز و نیاز کر کے رو دیا کرے گی اور میں اس کو بہت زور سے اپنے ساتھ بھینچ کر اس کے سارے دکھ اور سارے درد لے لوں گا اور وہ جب میرے سینے سے مسکراتے ہوئے جدا ہوا کرے گی۔تب وہ مجھے کہے گی کہ خادی! کاش مجھے پتا ہوتا تو میں شروع ہی سے تیرے سینے سے لگ جایا کرتی اور میرے یہ بال سفید نہ ہوتے۔۔۔۔

وہ بڑا کڑا وقت تھا۔اسلام آباد میں ماں کی ملازمت کرنے کا فیصلہ ایسا نہیں تھا کہ آپ دکان پر جائیں اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر دیں اور مطلوبہ شے گھر لے آئیں۔اسلام آباد کو ہم مقامی بستی والے کوئی اچھا شہر نہ جانتے تھے۔بڑے بوڑھے اس شہر کی آبادی کو قیامت کی ایک نشانی کے طور پر لیتے تھے۔دوسرا ماں کی عمر ایسی تھی کہ اس کا گھر سے یوں اسلام آباد شہر میں جانا بھی ملک برادری کو ناگوار تھا۔برادری والوں نے جرگے کے بعد بھی ماں کو سمجھانے کی غرض سے کچھ لوگوں کو بھجوایا کہ خادی کی ماں! تمہارا یوں گھر گھر کام کرنا باعث عزت نہیں،تم خود جوان ہو،خوش شکل ہو سو طرح کی دنیا ہے سو طرح کے حادثے ہو سکتے ہیں۔یاد رکھو جن بچوں کے لیے تم یہ سب کچھ کر رہی ہو نا! خدانخواستہ ایسا ویسا کوئی حادثہ ہو گیا تو تمہارے یہی بچے دھتکار دیے جائیں گے۔ماں کی ہزار خوبیوں کی ایک خوبی یہ کہ وہ ان خدائی خدمت گاروں کو جواب ہی نہ دیتی تھیں البتہ بات کرنے والے یا والی کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے محبت اور شکر گزاری کے جذبات کا تاثر دیتے ہوئے دیکھتی رہتیں اور دوسرا بندہ لاجواب ہی ہو جاتا۔سوائے ہماری منجھلی ممانی جان کے کہ وہ لاجواب ہو کر بھی بولتی ہی رہتی تھیں۔ان کی مثال ایک تبوڑی کی تھی جو کاٹ ہی لیتی ہو۔اُسی جرگہ کے بعد چچا دادن نے ماں کو منانے کے لیے ماما جی سے کہا۔ماما جی اور ممانی اپنے بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آئے۔اس دن ماں کو کسی گھر سے صدقے کا گوشت ملا تھا۔ماں نے ان کے آنے سے پہلے ہی اس کو خشک خشک سا بھونا ہوا تھا۔جس کی مہک سارے محلے میں پھیلی ہوئی تھی۔ماں گرم گرم چپاتیاں بناتی رہیں اور ہم سب کھاتے گئے اس کے بعد ماما جی عشا کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ماں نے ابھی پہلا نوالہ توڑا ہی تھا کہ ممانی جان نے ان کے کان میں نجانے کیا کہا کہ ماں کا رنگ ہی متغیر ہو گیا۔ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور ماں نے اونچی آواز میں کلمہ پڑھا اور نوالہ رکابی میں چھوڑتے ہوئے اٹھیں اور بولیں ''اس کلمے کی قسم بھابھی تم نے آج حد پار کر لی۔'' ماں کو یوں دیکھ کر ممانی ڈر گئیں اور وہ ماں کو منانے لگیں مگر ماں ان کی ایک نہیں سن رہی تھیں۔ماں میری طرف مڑیں ''خادی! ماما جی کو بلا لا'' اتنے میں ماما جی اندر آئے۔ہم بہن بھائیوں نے ماں کو جیسا اس دن غصے میں دیکھا تھا اس کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔ماما جی نے ماں کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے کیوں کہ وہ اپنے بیوی کی بد خصلتی سے آگاہ تھے۔ماما جی نے وجہ جاننا چاہی مگر ماں نے اس سے کہا کہ اُبھی کے ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ بس۔ماما جی نے جب اصرار کیا تو ''ماں نے کہا کہ میں تیرے ان چار بچوں کا لحاظ کر رہی ہوں ورنہ میں تمہیں ضرور بتاتی کہ اس نے مجھے کیا کہا ہے۔ان کو لے اور نکل جا میرے گھر سے۔'' ماما جی شرمندہ شرمندہ اپنی بیوی اور چاروں بچوں کو لے کر چل دیے۔ماں دیر تک روتی رہی کہ کوئی بہن ہوگی جو اپنے بھائی کو رات گئے اپنے گھر سے نکالے پھر خود ہی بولی کہ میں بھی تو مجبور تھی۔پھر جب بختاور اس کے لیے کھانا لے کر گئی تو اس نے اس کے کان میں سب کچھ کہہ دیا پھر دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتی رہیں۔مجھے اور متو کو اپنے ماموں زادوں کے جانے پر کئی دن ملال رہا تھا۔اسی طرح ایک دو اور رشتے دار بھی ماں کے پاس آئے مگر ماں نے سب کو نکا سا جواب دے دیا کہ وہ اس کام سے باز آنے والی نہیں۔اب جرگے کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔

جرگہ کے فیصلے سے ماں تنہا ہو گئیں۔باقی دنوں کا مسئلہ نہیں تھا۔جمعے کو چھٹی والے دن کا مسئلہ تھا کہ ماں ہم چھوٹے بچوں کو کس کے پاس چھوڑ کر کام پر جاتیں۔سو وہ ہمیں ساتھ لے جاتیں اور ہم گرمی سردی میں ان بڑے بڑے بنگلوں کے گیٹوں کے باہر کسی ایک جگہ بیٹھ جاتے تھے۔بارش والے دن ماں چوکیداروں کی منت کر کے ان کے لیے بنی چوکی میں ہم تینوں کو ٹھہرا دیتی تھی۔بڑی کوفت اور پریشانی والا دن ہوتا تھا۔میری بہنیں سارا دن مجھے چمکارتی رہتی تھیں اور میں ان کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ماں کو کبھی بھی ہم تینوں نے اس کوفت اور پریشانی کی شکایت نہیں کی کیونکہ اس سے پہلے ہم بھوک کی تکلیف دیکھ چکے تھے لہٰذا اب پھر ہم نے وہ اذیت نہیں سہنی تھی۔گاؤں والوں کے نان نفقے کی بندش سے بڑی پریشانیاں آئی ہوں گی مگر ہم بچوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا البتہ چچا دادن کا سو روپے کا وظیفہ اور فصل کا برائے نام حصہ ہمیں ملتا رہا۔کچھ رشتے دار بھی چھپ چھپا کے عید شب برات پر اناج یا زکوۃ بھجوا دیتے تھے۔

وہ بہت کڑا وقت تھا مگر وقت تو گزر ہی جایا کرتا ہے بختاور دسویں میں پہنچی تو ماں نے ہمیں چھٹی والے دن ساتھ لے جانا چھوڑا۔اب ہم نے گھر کو مورچہ بنا لیا۔جس دن بخت کا دسویں کا نتیجہ آیا تو ماں نے اس کا

نتیجہ دیکھا اور مٹھائی لیے گھر لوٹی تو بختو برآمدے میں کھڑی تھی۔ ماں نے اسے خوشخبری سنائی کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوگئی ہے تو وہ ماں سے لپٹ کر رو دی۔ ماں کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ چھوٹ گیا اور اس نے اس کو خود سے دور کرتے ہوئے پوچھا کیا ہوا ہے تجھے۔ ماں کا رنگ اڑ چکا تھا وہ چلائیں ''بول لڑکی؟ کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا۔'' ماں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ بختاور کے بولنے سے پہلے اس کی روتی آنکھوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل میں جھانک لیتی۔ بختاور بولی'' میں نے کالج نہیں پڑھنا۔ اب میں تیرے ساتھ کام پر جایا کروں گی۔ بس بہت پڑھ لیا۔'' ماں جب اس فلمی سین کو جان گئی تو دھڑام سے وہیں برآمدے کی فٹ پیھری پر بیٹھ گئی۔ آج میں سمجھ سکتا ہوں کہ روتی بیٹی کو دیکھ کر ماں پر ان چند ثانیوں میں کیا گزر رہا ہوگا۔ ماں کو جب متو نے پانی کا گلاس دیا تو ماں نے قدرے درشتی سے کہا'' بختو تو کالج پڑھے گی۔ کام تیری ذمہ داری نہیں تو بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا۔۔۔ پھر میں دیکھوں گی کون مجھے حقارت سے دیکھتا ہے اور کون میری تذلیل کرتا ہے۔۔۔'' ماں کے ہونٹوں نے ماں کو رونے سے روکنا چاہا۔۔۔ ماں کی کانپتی انگلیاں مٹھائی کا ڈبہ کھولنے لگ گئیں۔ ماں کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تیرتے دیکھ کر میں اس کے قریب چلا آیا کہ بختاور سے تو وہ غصے ہے شاید آج وہ میرے ساتھ سرگوشی کرے اور مجھے گلے لگا لے۔ جب اس نے مجھے توجہ نہ دی تو پھر ماں کو سناتے ہوئے میں بولا کہ میں اب پنجم الف میں ہوں۔۔۔۔ ماں نے مجھے خود کے قریب دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولیں سارا ڈبہ تم تینوں کا ہے تو اکیلے بہنوں کا حصہ نہ کھا جانا۔ ماں نے بختاور ہی کو سینے سے لگایا اور ڈھیر ساری سرگوشیاں اس کے کان میں انڈیل دیں۔ اب جب وہ ماں کے سینے سے دور ہوئی تو اس کی آنکھوں کی چمک اس کی بختاوری کی نوید دے رہی تھیں۔ ماں نے اب اپنی زنبیل کھولی اور اس سے اس نے ہنڈی گوشت، میرے لیے دو جوٹھے چکن برگر اور سموسے نکالے۔

وہ وقت بہت کڑا تھا۔ بختاور کے ایف ایس سی کا رزلٹ نہیں آیا تھا کہ ماں کے ساتھ کام کرنے والی ایک خاتون ہزارہ کے کسی خاندان کے لڑکے کا رشتہ لے آئی۔ ماں نے چچا کو کسی کے ہاتھ اطلاع بھیجی لیکن چچا نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ہاں البتہ شادی سے ایک ہفتہ پہلے رات گئے چچی آئی اور دس ہزار روپے ماں کو دے گئیں۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا۔ چچی کچھ بولیں نہیں اور ماں نے لینے سے انکار نہیں کیا۔ سادگی سے شادی انجام پائی۔ دو ممانیاں اور ایک پھوپھی جان جو دوسرے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں اس موقع پر موجود تھیں۔ بختاور ڈاکٹر تو نہ بن سکی مگر سہاگن ہوگئی۔ بختو کو ماں نے دو کپڑوں اور دو انگوٹھیوں سے رخصت کردیا۔ میں اور متو حیران تھے کہ یہ کیسی شادی ہے جہاں میٹھے چاول بھی نہیں پکے۔ بختاور کی ڈولی نہیں نکلی بلکہ دروازے کے سامنے ٹیکسی کھڑی تھی اور اس کو بٹھا لے گئے۔ مہمان بھی ساتھ رخصت ہوگئے۔ ماں نے چھ پلیٹیں اور دو ڈونگے دھوئے اور برآمدے میں منہ سر لپیٹ کر لیٹنے لگیں۔ پھر میں اور متو گھر گھر کھیلنے کے لیے صحن میں بنی ایک کوٹھڑی میں جا پہنچے۔ متو نے مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا'' خادی! تمہیں معلوم ہے ماں نے اب ایسے منہ سر کیوں لپیٹ لیا ہے؟'' میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے، سوچنے لگا کہ متو بھی ماں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میرا نفی میں ہلتا سر دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں'' میں بتاؤں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔'' ابا سے لڑائی جو کرنی ہوتی ہے ماں کو۔ آج بختاور کی شادی اکیلے کی ہے نا! تو اب ابا سے رو رو کے لڑے گی۔'' میں نے آہستگی سے ماں کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ میں متو کا ہاتھ پکڑ ایک طرف لے گیا اور پوچھا کہ اس لڑائی کا اسے کیوں کر معلوم ہے۔ وہ ہنسی روکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی'' ہفتم ب، میں پڑھتی ہوں اور جب چھوٹی تھی تب بھی ساری ساری رات روتی ماں کو چپ کراتی اور اس کے آنسو پونچھتی تھی۔ تم بھی اس کے پاس سو کر دیکھنا نا! تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ ماں ابا سے کتنا زیادہ لڑتی ہے۔'' میں پھر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ پھر ماں نے متو کو آواز دی، متو بھاگی بھاگی گئی، ماں نے متو کو پاس بٹھا لیا سرگوشیاں کیں اور گلے لگا کر رو دی۔ میں ان دونوں کو دیکھتا رہا بختاور سے رشک کرتے کرتے میں ہفتم الف تک آ گیا تھا کہ ماں اب اپنی سرگوشیاں میرے ساتھ کرے گی اور سینے سے بھی مجھے لگایا کرے گی مگر ماں تو متو کے ساتھ سیٹ ہوگئی۔

وہ وقت بہت کڑا تھا اور میں نے جب میٹرک کیا تو ماں نے ایک میجر صاحب کہ جن کے گھر میں وہ ایک مدت سے کام کر رہی تھیں کہلا کر مجھے پاک آرمی میں سپاہی بھرتی کرا دیا۔ میں چچا سے ملنے گیا اور انھیں بتایا کہ میں فوج میں بھرتی ہوگیا ہوں تو انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور منمنائے کہ دیکھنا تمہیں کہیں دشمن کی گولی نہ لگ جائے، تیری ماں کی اکڑ کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ میں خفا خفا سا گھر آیا ماں بھانپ گئی مگر کچھ نہ بولیں۔ میں اپنی رجمنٹ میں چلا آیا اور ماں کو منع کردیا کہ اب گھر گھر کام کرنا چھوڑ دے۔ پہلی تنخواہ کا منی آرڈر ملتے ہی ماں نے سارے کام چھوڑ دیے۔ مجھے صرف آرمی کی وردی کا ہی معلوم تھا جب وہاں ٹریننگ شروع ہوئی تو چھٹی کا دودھ یاد آیا۔ سپاہی کی تربیتی مشقیں ایسی سخت اور تھکا دینے والی ہوتی ہیں، میرے وہم و گمان میں نہیں تھا لیکن جب یہ خیال آتا کہ ماں ملکانی بنی گھر میں بیٹھی ہوگی اور کہیں کام پر نہ جاتی ہوگی اور اس کے گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے استعمال سے ہاتھوں کی جلد نے پھٹنا چھوڑ دیا ہوگا تو میری تھکن ختم ہو جاتی اور میں مسرور ہو ہو جاتا تھا۔ ماں کے ہاتھ چونکہ روز کئی گھنٹوں تک پانی میں کام کرتے رہتے تھے تو اس کے ناخن کمزور ہو گئے تھے اور خود بخود ٹوٹ جایا کرتے تھے۔ اب تو ایسا نہیں ہوا کرے گا، یہ سوچ کر میرے دل میں ایک سکون کی لہر اٹھتی تھی۔

چھے ماہ کی تربیت کے بعد جب پہلا امتحان ہوا تو سب سے زیادہ نمبر میرے تھے۔ میرے نمبر اتنے زیادہ تھے کہ میرے صوبیدار صاحب نے مجھے بلا بھیجا اور میرا انٹرویو لیا اور جب ان کو میرے دسویں کے نمبروں کا معلوم ہوا تو بولے ایف اے کر کے کمیشنڈ افسر بنتے نا تم۔ ان کے منہ سے افسر کا لفظ سن کر مجھے ماں کا وہ خواب یاد آ گیا جو اس نے بختاور کے لیے دیکھا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن جائے گی تو کوئی اس کی تذلیل نہ کر پائے گا۔ میں نے صوبیدار صاحب سے پوری تفصیل سمجھی۔ وہ خود علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے مطالعہ پاکستان میں ایم اے کر رہے تھے۔ میں نے انہی کی رہنمائی میں ایف اے کا ارادہ باندھا۔ افسری کے خواب نے تو راتوں کی نیندیں اڑا دیں۔ فجر کی نماز لے کر عصر کی نماز تک پیریڈ اور ٹریننگ سے

ساتھی تھکے ہارے بارک میں پہنچتے تھے اور میں اس تھکا دینے والی تربیتی مشقوں سے تازہ دم بارک میں آتا تھا۔ دس بجے تک میں پڑھتا تھا کہ اس کے بعد بتیاں بجھا دی جاتی تھیں۔ مہینے میں چار دن رات کی چوکیداری بھی کرتا تھا۔ اس سے کتاب پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اپنی چوکی میں بیٹھ جاتا اور پچھلا سبق دہراتا اور افسری کے خواب دیکھتا رہتا۔ خاص کر یہ کہ جب ماں کو بتاؤں گا کہ میں افسر بن گیا ہوں تو ماں کے چہرے پر کیا تاثرات ہوں گے۔ اس دن کے بعد تو وہ مجھ سے ہی سرگوشیاں کیا کرے گی اور مجھے ہی گلے لگا کر روئے گی، بھلا میں کہاں اس کو رونے دوں گا۔ تین ماہ بعد جب گھر آیا تو ماں کے چہرے کا روغن ہی اور تھا۔ متو نے بتایا کہ جب منی آرڈر آیا تو ماں اس کے گلے لگ کے بہت روئی۔ اگلے دن سب گھروں میں بتا دیا کہ بیٹا کماؤ پوت ہو گیا ہے اب میں کام نہ کروں گی۔ ماں گھر پر ہی ہوتی ہے اور متو کو کالج لاتی لے جاتی ہے اور اپنا نماز روزہ کرتی ہے۔ متو نے یہ بھی بتایا کہ اکا دکا برادری والے بھی ان کے ہاں آئے اور ایک دو ماتم پر ماں گئی ہے تو کسی نے وہاں سے پہلے کی طرح اسے اٹھایا بھی نہیں۔ اس دفعہ کی سب سے خوشی والی بات یہ تھی کہ ماں کے ہاتھوں کی جلد بھی خاصی بہتر تھی۔

وہ وقت بہت کڑا تھا۔ فوجی تربیت کی سختی میں میری نصاب کی کتابیں میرے لیے ایک گوشۂ عافیت تھیں۔ لفٹ رائٹ کرتے، کہنیوں کے بل رینگتے، فوجی رائفل سے فائرنگ کرتے وقت بھی میں ان کتابوں کے دھیان میں ہوتا تھا، ڈیپارٹمنٹ سے اجازت لے کر داخلہ بھیج دیا اور بڑی آسانی سے ایف اے ہو گیا۔ نومبر میں پی ایم اے لانگ کورس ۰۹۸ کا امتحان تھا۔ لانگ کورس کے لیے ٹیسٹ دیا اور مجھے آئی ایس ایس بی کے لیے چن لیا گیا۔ صوبیدار بیدار شاہ بہت خوش ہوئے اور مجھے اپنے گھر پر کھانا کھلایا۔ آئی ایس ایس بی کے لیے بھی رہنمائی دی اور ڈیپارٹمنٹ کی اجازت سے میں وہاں گیا اور اللہ کے فضل سے کامیاب ہو گیا۔ زندگی نے پہلی بار ایک شاندار روپ بھرا تھا۔ ماں کو اس ساری کہانی سے آگاہ نہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنی ماں کو اپنی چھوٹی سی ناکامیابی کا بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اب جب رجمنٹ واپس آیا تو میں سیدھا صوبیدار بیدار شاہ کے گھر گیا اور ان کو خوشخبری سنائی۔ انھوں نے مجھے گلے لگایا۔ سارا سامان انھی کے گھر چھوڑ کر گاؤں آیا اور ماں کو کسی کورس کا بتا کر چھے ماہ کے لیے پی ایم اے کے لیے رخصت ہوا۔ جی بہت چاہا کہ ماں سے کہہ دوں پر ڈر تھا اگر کچھ گڑبڑ ہو گئی تو ماں کیسے سہہ پائے گی۔ پاسنگ آؤٹ پر ہی بتانے کا فیصلہ کیا۔ ماں سے چھے ماہ کی رخصت لے کے اپنے سامان کے ساتھ سیدھا ایبٹ آباد چلا آیا۔ پی ایم اے کے دو سال کی کہانی پھر کبھی سناؤں گا۔ اکیڈمی سے جب پہلی بار میں گھر لوٹا تو میرا پکا ارادہ تھا کہ میں کسی کو ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا بلکہ پاسنگ آؤٹ پر ہی اس راز سے پردہ اٹھاؤں گا۔ شام کو گھر پہنچا تو ماں نے رات کھانا کھاتے ہوئے کہا کہ وہ اس سارے عرصے میں ایک ہی خواب بار بار دیکھ رہی ہے کہ سارے گاؤں کے لوگ ایک میدان میں جمع ہیں اور اس سمیت ساری دنیا زمین پر بیٹھی ہے، دور مگر ذرا اونچائی پر ایک چارپائی ہے اور اس پر تیرے دادا بابا کے ساتھ کوئی صاحب یعنی بڑا افسر بیٹھا ہے اور میں اس چارپائی کی طرف اس غرض سے جاتی ہوں کہ اپنے سسر کے ساتھ بیٹھے ہوئے بندے کو پہچان لوں۔ جب میں قریب ہوتی ہوں تو وہ بندہ اپنا منہ چھپانے کی غرض سے دوسری طرف مڑ جاتا ہے اور میں اور آگے بڑھتی ہوں اور اسے دیکھ لیتی ہوں اور وہ تم ہوتے ہو۔ تمھارے دادا مجھے یوں تمہاری چوری پکڑتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور تو میرے ساتھ لپٹ جاتا ہے۔ اب ماں کے خواب کی تعبیر اسے نہ بتانا میرے بس میں نہ تھا۔ ماں کی خوشی کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ کیا نہیں جا سکتا۔ ماں خود کلامی کرنے لگی خادی تو واقعی اللہ کا انعام ہے۔ میرے ساتھ جو رویہ میرے اپنوں نے رکھا اس کی لاج اللہ نے رکھ لی اور میرے رب نے تیری صورت میں میری طرف سے سب کو جواب دے دیا۔ پھر ماں سجدے میں گر گئی اور اونچی اونچی آواز میں اللہ سے باتیں کرتی رہی۔ ماں کا ایک جملہ ابھی بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ ماں دعا کرتے ہوئے بولی "اللہ میں نے تو ساری عمر تجھ سے اونچی آواز میں دعا مانگی نہ میں بلند آواز میں روئی کہ میرے بچے پریشاں ہوں گے اور میرے دشمن خوش۔۔۔ مگر تو نے میرے ضبط کردہ آنسوؤں اور دلی دعاؤں کا بھی حساب رکھا۔ اللہ تو واقعی اللہ ہے۔"

میں خوابوں، ارمانوں اور سچے جذبوں کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں لیے پی ایم اے اکیڈمی کاکول گیا تھا اور جب وہاں سے باہر نکلا تو سبھی خوابوں کی تعبیر کا اذن میرے پاس تھا۔ سپاہی خادی خان، سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا تھا اور پھر اللہ کی مدد اور اپنی ماں کی دعا سے بریگیڈیئر خادی خان بن کر ریٹائر ہوا۔ پاسنگ آؤٹ والے دن ماں نے مجھے گلے لگایا اور ڈھیر ساری سرگوشیاں کیں اور میرا یہ ارمان بھی پورا ہو گیا کہ کسی دن ماں مجھے سرگوشیاں دے مجھے اپنے ساتھ بھینچے۔ ماں نے اس دن ابا کے مرنے سے لے میرے پاس

آؤٹ ہونے تک کہ کہانی کہہ دی۔اپنے ارمانوں اور خود بیتی بھی بیان کر دی۔ اس دن اتنی بھیڑ میں ہم دونوں اکیلے تھے جیسے ان دنوں میں ہم اکیلے تھے جب ماں نے ساری برادری سے ٹکر لی تھی۔ میں ایک آرمی افسر کی زندگی جیا اور میری ماں میرے ساتھ جئیں۔میری ایک ایک کامیابی ان کی دعاؤں ثمر اور ان کے خوابوں کی تعبیر ہے۔اللہ نے زندگی کو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ بچپن کا خیال جب بھی آتا تو وہ لمحہ شکر گزاری میں ڈھل جاتا۔ماں نے جس تعلیم کے بیج کو اپنی جوانی، بیوگی اور توکل سے بویا تھا آج اس کا پھل ایسے ظاہر ہوا کہ بختو کی دو بیٹیاں ڈاکٹر اور بیٹا پولیس میں ایس ایس پی ہے۔ متو کی ایک بیٹی انجینئر نگ کر رہی ہے دونوں بیٹے پشاور یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں۔میرے دو بیٹے سکول اور بیٹی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے۔ماں آج بھی میرے ساتھ زندہ ہیں اور ان کے ملائم ہاتھوں کے نرم نرم پور جب میرے بچوں کی پیٹھوں کو کھجاتی ہیں اور بچے اپنی ان گدگدیوں سے ہنستے ہیں تو ماں کی آنکھیں جو کہانی بتاتی ہیں وہ شاید میں ہی جانتا ہوں۔ بچے جب اس گدگدی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہیں اور ان سے چپکتے جاتے ہیں تو وہ ان پر صدقے واری جاتی ہیں۔ جب بچے ان سے پوچھتے ہیں کہ دادی جان کیا آپ بابا کو بھی ایسے کیا کرتی تھیں تو وہ لمحہ بھر کے لیے پتھر کی ہو جاتی ہیں، پھر بولتی ہیں میں خادی کو ایسا کرتی تھی لیکن اس کو ایسی گدگدی نہیں آتی تھی۔ بچے پھر حیران ہو ہو کر ہنستے جاتے ہیں۔

اس دفعہ چھوٹی عید پر ہمیشہ کی طرح بخت اور متو بچوں سمیت ہمارے ہاں آئیں۔انتیسویں افطار کے بعد چاند کے انتظار میں ہم سب نے دس بجا دیے تو معلوم ہوا کہ کل عید نہیں روزہ ہے۔اس غیر متوقع خبر سے سب بچے اداس ہو گئے۔ماں نے بچوں کے لیے آئس کریم منگوائی۔بیگم نے آیا سے کہہ کر میرے لیے چائے اور ساتھ میں باسی پکوڑے جو وہ باہتمام ایک ڈونگے میں رکھتی ہیں منگوائے۔بختو نے سب بچوں سے کہا کہ بریگیڈیر صاحب سے پوچھو نا کہ وہ باسی پکوڑے کیوں کھاتے ہیں؟ میں بختاور کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ماں کی آواز آئی بولیں اور خادی سے پوچھو کہ جب وہ گاؤں والے گھر ٹی وی لے کر آیا تھا تو متو نے کیا کیا تھا؟ متو نے شور مچایا نہیں ماں نہیں ماں۔۔۔ سارے بچے ہوشیار ہو بیٹھے۔ان سب کو ہمارے ماضی سے بہت لگاؤ تھا کہ ماں وقتاً فوقتاً ان کو کہانیاں سناتی رہتی تھیں۔ بچوں کے چہروں پر اداسی غائب اور خوشی کے آثار دیکھ کر ماں نے مجھے اشارہ کیا کہ جب اپنی ساری کہانی سنا دی ہے تو یہ بھی بتا دے نا خادی خان۔اب تو حکم تھا اور میں پاک آرمی کا افسر حکم کے معنی جانتا تھا۔میں نے کہا بچو! ہماری کہانی کوئی ایسی نہیں جس کو سنا جائے بس ایک بیوہ ماں کی محنت تھی جو رنگ لائی۔علم کی جیت ہوئی اور جہالت کی ہار۔میری بیگم نے پھر بات کاٹی۔بات نہ بدلیں اور بچوں کو بتائیں کیوں باسی پکوڑے اچھے لگتے ہیں آپ کو؟ ماں بولیں یہ بھی بتاؤ کہ ٹی وی دیکھ کر متو نے کیا کیا تھا۔ میں بھی ہنس دیا۔بچو! جب میں ٹی وی خرید کر لایا اور اس کو آن کیا تو اس پر ایک آدمی خبریں پڑھ رہا تھا، متو جو ٹی وی کے بالکل پاس کھڑی تھی، اس کی جب اس پر نظر پڑی تو یہ بھولی اس کو غیر محرم جان کر گھبرائی اور بولی ''ہائے اللہ!'' اور منہ پھیر کے دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ لیا۔اب جو قہقہہ پڑا تو یوں لگا ٹی وی لاؤنج کوئی تھیٹر ہے۔متو نے ابھی بھی دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔''اور باسی پکوڑے؟'' بختاور کی بڑی بیٹی نے چہک کر یاد دلایا۔

''او یار! اپنی دادی سے پوچھو!'' ماں بولیں ''مجھ سے کیوں پوچھیں۔۔۔تم کو پتا ہوگا تمہیں اچھے لگتے ہیں۔'' بیگم بھی ہنسی ضبط کیے مسکرائے جا رہی تھیں۔ میں دل میں بولا برے پھنسے ہو خادی خان۔۔میں کروٹ بدلتے ہوئے سب سے نہیں خود سے ہی مخاطب ہوا کہ اپنے ماضی کی کہانی کچھ ایسی خاص نہیں ہے بچو! کہ اس کو دہرایا جائے مگر اب آپ سب کا اصرار ہے تو مجھے سنانے میں کوئی دقت بھی نہیں۔باسی پکوڑوں کی کہانی یہ ہے کہ ماں جب تین چار گھروں میں کام کیا کرتی تھیں تو وہ مہربان لوگ اپنے گزرے کل کا بچا کھچا کھانا سالن، فروٹ اور بھی بہت کچھ ماں کو دے دیا کرتے تھے جیسے اب آپ لوگ اپنے گھر کی ملازماؤں کے ساتھ برتتے ہو۔رمضان میں خاص کر باسی پکوڑے خاصی مقدار میں ماں لایا کرتی تھیں اور پھر اگلے دن میں ان پکوڑوں کو کھاتا رہتا تھا۔ان باسی پکوڑوں کا کچھ ایسا ذائقہ بنا ہے کہ اب میں باہتمام پکوڑوں کو باسی ہونے دیتا ہوں اور پھر کھاتا ہوں۔۔۔تازہ بھی کھا لیتا ہوں مگر جو مزہ باسی پکوڑوں میں ہے، وہ تازہ میں کہاں۔۔۔ بچے محویت سے میری باتیں سن رہے تھے اور ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن روشن تھیں۔ان کا ماتھا فخر سے جگمگا رہا تھا کہ ان کا بیٹا اپنی اصل کو بھولا نہیں اور وہ اپنے اس حقیقی لباس میں تو اور بھی خوبرو لگ رہا تھا۔

❀❀❀

غزل/عبدالوحید بسمل

میں تیرا مان رکھتا ہوں تُو میری ترجمانی کر
جنوں شوق ! پھر سے آ، ذرا تازہ کہانی کر
تجسس کی بھری دنیا میں پھیلے کچھ اشارے ہیں
اشاروں کی زباں سمجھوں بس اتنی مہربانی کر
دکھا کر حسن کے جلوے نگارستاں بناتا ہے
عدو، پھر آ کے کہتا ہے، بسر اس میں جوانی کر
محبت کا تقاضا ہے تو تیری قدر کرتا ہوں
مگر تجھ سے نہیں کہتا کہ میری قدر دانی کر
الجھ جاتا ہوں میں تیرے اشاروں اور کنائیوں میں
وضاحت ان کی خود آ کر معانی در معانی کر
عروج قوم کے قصے کتابوں میں ہیں بند اب تک
وہ یادیں اور باتیں تو کبھی تازہ، پرانی کر
گراں گذرا، تمھیں جس دن سے دیکھا غیر لوگوں میں
پلٹ آ ! دور بسمل سے طبیعت کی گرانی کر

دانا اور جال

حافظہ زینب خالد/ لاہور وومن یونیورسٹی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ ایک دن ایک شکاری پرندوں کے شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ وہ شکار کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگا اور اسی دوران وہ ایک سرسبز جگہ پر پہنچا۔ جس جگہ پر اس نے پرندوں کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے پرندوں کو پکڑنے والا جال تیار کیا اور اس کی رسی کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا اور اس جال کے نیچے اس نے کچھ گندم کے دانے اور کچھ جو کے دانے بکھیر دیے۔ اور اس جال کے رسے کے سڑے کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اور کچھ قدم کے فاصلے پر ایک پھولوں کے درخت کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے کچھ سبزہ اور گھاس پھوس جمع کیا۔ اور اس نے وہ گھاس پھوس اپنے جسم، اپنے منہ اور اپنے پاؤں پر وہ سبزا اوڑ لیا۔ اور پرندوں کے انتظار میں واہاں پر لیٹ گیا

ایک طرف سے جو ہے ایک تیز رفتار پرندہ کی جس نے دور سے جنگل کے سرسبز مناظر اور درختوں کا نظارہ کیا تھا وہ وہاں پہنچا اور وہ اوپر سے نیچے کی طرف آیا اور اس شکاری سے کچھ ہی فاصلے پر۔ زمین پر اترا اور دانے کی تلاش کرنے لگا یا دآنے کو ڈھونڈنے لگا

جیسے ہی پرندہ اس شکاری کے کچھ پاس آیا تو شیکاری کو چھینک آ گئی۔

اور پرندہ اس کی آواز سے سمجھ گیا کہ یہاں پر کوئی موجود ہے اس نے اپنے اردگرد کا خود جائزہ لیا اور جب وہ شکاری کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک انسان گھاس پھوس وس پہنے ہوئے بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اس کی شناخت کی اور اس کو دیکھا۔ اب ایسا تھا کہ وہ اس سے کچھ فاصلے پر گیا اور اس نے شکاری پر غور کیا اور پھر اس کے مدمقابل جا کر بیٹھ گیا

اور اسے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: اے سبز • پوش انسان تم کون ہو؟ اور تم اس سبزے کے اندر کیا کر رہے ہو؟

شکاری نے کہا: اے عزیز پرندو میرے کام میں مداخلت مت کرو اور اپنا کام کرو میں ایک متقی، پرہیز گار اور عابد انسان ہوں اور دنیا سے کنارہ کشی کر چکا ہوں اور میں نے لوگوں سے اپنے آپ کو دور کر لیا ہے اور میں یہاں پر موجود ہوں۔ اور میں یہاں پر عبادت و ریاضت میں مشغول ہوں۔

پرندے نے کہا:

میں یہ نئی بات سن رہا ہوں کہ انسان جنگل کے بیچ میں گھاس پھوس کے اندر چھپ کر اللہ کی عبادت کر رہا ہے۔ کیا بات ہے ☆

کیا مطلب ہے اس بات کا؟ میری نظر میں دنیا سے قطع تعلق ہو جانا اور اپنے آپ کو لوگوں سے دور کر لینا کوئی اچھا کام نہیں ہے گھاس پھوس کے نیچے چھپ کر یا جنگل میں بیٹھ کر عبادت کرنا لازم نہیں ہے تمہیں چاہیے کہ تم جس جگہ شہر یا گاوں میں جس جگہ پر زندگی گزار رہے ہو وہاں جا کر خدا کی عبادت کرو اور اپنے کام بھی کرو اور اپنی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچاؤ۔

تم یہاں پر سب سے بے مقصد بے فائدہ ایک گھاس کے نیچے بیٹھے ہو اور تم اللہ کی عبادت کر رہے ہو؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ کہتے ہیں خدمت خلق سے بڑھ کر اور کوئی عبات نہیں ہے

اور درویشوں کا لباس جائے نماز اور سجدے کے علاوہ کچھ نہیں

شکاری نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک سادہ پرندے ہو اور تم لوگوں کو نہیں پہچانتے۔ اس نے کہا:

لوگ بہت بڑے ہیں اور لوگ کسی کو بھی فائدہ نہیں دیتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں دھوکا اور فریب کرتے ہیں اور مکر اور فریب سے کام لیتے ہیں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں اور تمام لوگ دنیا اور مال و دولت کی فکر میں لگے ہوئے ہیں میرا دل جو ہے وہ بہت نازک ہے اور میں ان چیزوں کو

دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا میں نے بھی ایک عرصہ تک یہی کام کیا ہے اور میں نے ب• ی لوگوں کو اپنی ذات سے فائدہ پہنچایا ہے اور اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میں اکیلا رہ گیا ہوں اور میں اپنی آخرت کی فکر کر رہا ہوں

میری خوراک کے لیے جنگل کی گھاس پھوس کافی ہے اور میرے لباس کے لئے درختوں کے پتے کافی ہیں تو میں کس طرح سے دنیا کی فکر میں ہوں؟

پرندے نے جواب دیا یہ سب ٹھیک ہے لیکن آخر کار تم جنگل کے حیوان تو نہیں ہو۔ جو انسان زندہ ہو اسے چاہیے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح ہو۔ اگر دوسرے لوگ برے ہیں تو تم اچھے بنو تا کہ دوسرے لوگ تم سے کوئی اچھائی سیکھیں اور اس پر عمل کریں تم سوچو کہ اگر اچھا ہونا اسی طرح سے ہے اور تمام لوگ اسی طرح سے کریں کہ وہ تمہاری طرح گوشہ نشین ہو جائیں۔ تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اچھا کام وہی ہے کہ جس کو سب لوگ کر سکیں یہ ایک اچھا کام اور عبادت نہیں ہے

عبادت تو یہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی چیز ملے تو ہم اس سے کنارہ کشی کر لیں اور دنیا کی زندگی کو بہتر کریں نہ کہ ہم اپنی دنیا اور آخرت خراب کر لیں۔

تمام پیغمبر، امام، دانشمند اور اچھے لوگوں اور عقل

مند لوگ انہوں نے اسی طرح سے زندگی گزاری ہے اور دوسرے لوگوں کا غم اور دوسروں کی تکلیف اٹھائی ہی۔تم نے کبھی ایسا بھی سنا ہے کہ ایک آدمی اپنے آپ کو اس طرح جنگل میں گھاس پوس کے نیچے چھپا لے اور چھپ کر بیٹھ جائے اور صرف اپنی فکر کرے۔

میں نے ایسا نہیں سنا یہ کام جو ہے یہ خود پسندی ہے۔یعنی صرف اپنے آپ کی فکر کرنا کہ تم کسی کا خیال نہ کرو صرف اپنے آپ کی فکر کرو اپنی آخرت کا خیال کرو۔

شکاری نے کہا: اے پرندے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے حالات سے آگاہی دو

وہ کہتا ہے: کہ میں نے بہت سارے لوگ دیکھے ہیں اب جب کہ میں مرنے کے قریب ہوں تو یہ میرے لئے ایک عبرت کا سبب بنا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میں مزید اپنی موت سے غافل رہوں یہ ایک عجیب چیز ہے اب جب کہ میں لوگوں سے کنارہ کش ہو چکا ہوں۔اور تم مجھے اس طرح نہیں دیکھنا چاہتے کہ میں خدا کی فکر میں یا اس کی یاد میں مشغول ہوں تو میں چاہتا ہوں کہ تم میرے کام میں مداخلت نہ کرو اور جاؤ

پرندے نے کہا: بہت خوب بہت اچھا اور وہ اپنے راستے پر چل پڑا ابھی وہ کچھ قدم آگے ہی گیا تھا کہ اس کی نگاہ گندم اور جو کہ دانوں پر پڑی جو کہ جال کے نیچے بچھائے گئے تھے اس نے خود سے سوچا یہاں پر تو سبزہ ہی سبزہ ہے اور گندم کا ایک بھی دانہ موجود نہیں ہے تو اس جگہ پر اتنے زیادہ دانے کیسے موجود ہیں اس کا بہت دل چاہا کہ وہ جائے اور انہیں کھالے۔لیکن ابھی وہ شکاری کی باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔کہ خدا کی عبادت آخرت اور موت۔ اور وہ ڈر رہا تھا کہ جو سبزہ پوش شخص ہے جو انسان ہے وہ اس پر اعتراض نہ کرے پھر اس نے یوں کیا کہ وہ لوٹا اور اس نے شکاری شخص سے پوچھا کہ یہ جو اور گندم جو ہیں تمہاری ملکیت ہیں شکاری نے کہا: نہیں میرے عزیز یہ میری ملکیت نہیں ہے حقیقت تو یہ ہے کہ میں دنیا میں سے کوئی بھی چیز اپنے پاس موجود نہیں رکھتا یہ گندم اور جو میری چیزیں نہیں ہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ جو دانے ہیں وہ دو دیا تین بچوں کے ہیں جو کہ وہ چھوٹے ہیں۔وہ یہاں پر آئیں اور انہیں لے جائیں۔اور اگر تم اس سے سبزہ میں سے کچھ کھانا چاہو تو وہ تم پر حرام ہے۔اگر کوئی شخص بہت زیادہ مستحق ہو اور وہ بھوک کی وجہ سے مرنے کے قریب ہو تو وہ یہ کھا سکتا ہے۔ پرندے نے کہا: اچھا! میرا ایسے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے۔پرندہ جس کا منہ لالچ کی وجہ سے بھر چکا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنے اچھے دانوں کو چھوڑے۔اس نے کہا: حالات کے لحاظ سے میں اس کا بہت زیادہ مستحق ہو اور قریب ہے کہ میں بھوک سے مر جاوں۔میرے خیال میں اگر کوئی میری طرح بھوکا ہو تو وہ اگر مردار کا گوشت بھی کھالے۔تو وہ اس پر حلال ہوگا۔

شکاری نے کہا:

میں یہ بات نہیں جانتا میرا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔میں اپنے حالات کو خود بہتر طریقے سے جانتا ہوں اگر تم کسی بھی طرح سے اس کے مستحق نہیں ہو تو تمہیں اس کا گناہ ہوگا۔ کیونکہ پھر کوئی دوسرا پرندہ ایسے نہیں کھا سکے گا۔پرندے نے سوچا اور اس نے جواب دیا اب ایسا ہے کہ میں اس گندم میں سے کچھ دانے کھا لیتا ہوں ان کو کھانے سے میرے اندر کچھ طاقت آجائے گی اور میں نہیں مروں گا اور جس کا بھی یہ مال ہے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس نے کہا اور وہ دانوں کی جانب چل پڑا اس نے اپنا منہ کھولا اور کھانا شروع کر دیا لیکن ان تمام دانوں کے ساتھ سب سے پہلے وہ جال گرا اور وہ اپنے آپ کو اس جال سے بچا نہیں سکا۔اس وقت وہ سمجھا کہ یہ تمام باتیں اسے فریب دینے کے لئے کہی گئی تھیں۔

جب شکاری کو اس کا مقصد حاصل ہو گیا تو وہ گھاس پھوس کے نیچے سے باہر آیا۔اور اس نے پرندے کو پکڑ لیا۔پرندے نے کہا: میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ کیا ہے۔

اس کی کیا سزا ہے کہ تم اپنے آپ کو آپ کو عابد اور متقی کہتے ہو۔لیکن کئی لوگوں کو دھوکا دیتے ہو۔اور کسی کو جال میں پھنساتے ہو تا کہ اسے کھالو۔ شکاری نے کہا: جو کچھ بھی تم کہہ رہے ہو میں اسے نہیں جانتا۔لیکن اس وقت تمہارے اور میرے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔میں بھی تمہیں بے حساب لفظوں سے فریب دیا ہے۔میں نے کہا کہ میں عبادت گزار ہوں اور تم نے بھی کہا کہ تم مستحق ہو۔

یہ بالکل اسی طرح ہیں اب تم یہ گندم کے دانے کھاؤ اور میں تمہیں کھاؤں گا۔کیونکہ میں نے اپنی عبادت اور ریاضت کا صلہ حاصل کر لیا ہے۔

اب تمہیں اس بات کو قبول کرنا ہوگا۔کہ یہ تمہارا اپنا ہی لالچ تھا کہ جس نے تمہیں فریب دیا۔اور جو شخص بھی کسی حال میں یا مصیبت میں ہوتا ہے اپنی لالچ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگر میں اس وقت نا چھینکتا تو کیا تم پھر بھی واپس جاتے؟ یا پھر تم کھاتے اور اس جال میں گرفتار ہو جاتے۔

تمہیں اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ جس جگہ بھی دانہ موجود ہے وہ جال ہے تم نے خود ہی ایسا کیا اور تم نے خود ہی اس کی تدبیر نہیں کی۔

شاعری

ترے تقاضوں پہ چہرے بدل رہا ہوں میں
نئے زمانے ترے ساتھ چل رہا ہوں میں
چراغِ آخرِ شب ہوں مگر ابھی سورج
سکون سے تو نکلنا کہ جل رہا ہوں میں
یہ چاہتا ہوں کہ ہر رُخ سے دیکھ لوں دنیا
یہ زاویے جو نظر کے بدل رہا ہوں میں
ذرا سا وقت ہے اور دور میری منزل ہے
اسی لیے تو بہت تیز چل رہا ہوں میں
مرے خدا میں پلٹ آؤں اپنے بچوں میں
دُعائیں مانگتا گھر سے نکل رہا ہوں میں
نئی ہوائیں ابھی سب گھروں تک آئی نہیں
ابھی تو ہاتھ کا پنکھا ہی جھل رہا ہوں میں
طلوع جب نہ ہوا اُس کے ساتھ میں اظہر
تو کیوں یہ چاند کے ہمراہ ڈھل رہا ہوں میں

اظہر عنایتی/بھارت

اپنے حالات کے دھاگوں سے بنی ہے میں نے
آج اک تازہ غزل اور کہی ہے میں نے
کس ضرورت کو دباؤں کسے پورا کر لوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے
میں تو جیسا بھی ہوں سب لوگ مجھے جانتے ہیں
تیرے بارے میں بھی اک بات سنی ہے میں نے
روزمرہ میں کہے جتنے بھی اشعار کہے
شاعری میں بھی کٹھن راہ چنی ہے میں نے
چھوٹے لوگوں کو بڑا کہنا پڑا ہے اکثر
ایک تکلیف کئی بار سہی ہے میں نے
میرے شعروں میں دھڑکتا ہے مرے عہد کا دل
شاعری کی ہے کہ تاریخ لکھی ہے میں نے
زندگی نے مجھے سینے سے لگا رکھا ہے
جان جس دن سے ہتھیلی پہ دھری ہے میں نے
اپنے عیبوں کو عیاں کر کے خجل ہوں لیکن
یہ جسارت بھی اگر کی ہے تو کی ہے میں نے
ایک سے دوسرا انسان جدا ہے نصرت
ہر جبیں پر نئی تحریر پڑھی ہے میں نے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

ساحری

شوخ غمزوں کی سرکشی جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی
کسی شہنائی، بانسری جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

بانوری، سانوری، پری جیسی
منچلی، مست، کامنی جیسی
آرتی جیسی مورتی جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

نرم ہونٹوں کی راگنی جیسی
گرم نظروں کی ساحری جیسی
خوبرووں کی دلبری جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

شبنمی گھاس کی نمی جیسی
سرخ پھولوں کی پالکی جیسی
مرغزاروں کی مورنی جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

لذت آمیز تشنگی جیسی
سحر انگیز، خیرگی جیسی
وادیٔ گل کی چاندنی جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

سرخ جوڑے کی دلکشی جیسی
اک معطر سی اوڑھنی جیسی
خاص رشتے کی تازگی جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

ایک بے باک شعلگی جیسی
اک شرارت بھری ہنسی جیسی
وصل میں خود سپردگی جیسی
شاعری ہو تو شاعری جیسی

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

کوئی قانون نہیں ہے یہاں دستور نہیں
بے اصولی سے تو جینا مجھے منظور نہیں
بعد میں اپنا ہنر بھی وہ دکھائیں گے تجھے
شیشہ گر کہتے ہیں آئینہ ابھی چور نہیں
میری شوریدہ سری قیس سے آگے ہے کہیں
گو جنوں میرا جہاں میں ابھی مشہور نہیں
رسمِ حلاج نبھانے کو میں مصلوب ہوا
شہر کے لوگ نہ سمجھیں یہاں منصور نہیں
یا تو بینائی سے عاری ہیں مکیں بستی کے
یا یہاں سحر کے ماتھے پہ کوئی نور نہیں
شوق ہے شرط تجھے منزلیں خود ڈھونڈیں گی
عشق رہبر ہے تو منزل بھی تری دور نہیں

نیم جاں چھوڑ گیا ہے مجھے مقتل میں جلیل
راحتِ مرگ مجھے دے اسے منظور نہیں

احمد جلیل/اوکاڑا

کون کہتا ہے کہ رہتے ہیں خیالِ یار میں ہم
ہاں نہیں ہوتے مگر اپنے ہی اختیار میں ہم
دسترس میں تھا ستارہ اور اپنے ہاتھ میں تھا
پر نہ جانے کیوں رہے ملنے کے انتظار میں ہم
سن رہے ہیں آج کل ہیں رابطے بھی غیر سے اب
میں یہ سوچا رات دن رہتے ہیں کس غبار میں ہم
لوگ کہتے ہیں جڑی ہے چاند کی وہ روشنی سے
جھیل میں دیکھا تھا اس کو تب سے ہیں خمار میں ہم
دور ہو جائیں اگر وہ مجھ سے تو کوئی گلہ نہیں
ایک مدت ہوگئی پھرتے ہیں اک مدار میں ہم

کرنل سیّد مقبول حسین/راول پنڈی

کھل گئے یادوں کے در بارش کے بعد
دل ہوا آباد گھر بارش کے بعد
ایک دریا درمیاں حائل ہوا
میں اِدھر تھا وہ اُدھر بارش کے بعد
ہٹ گیا ہو اُس کے چہرے سے نقاب
اس طرح نکھری سحر بارش کے بعد
ہو بیاں وہ کیفیت کیسے بھلا
جھومتے ہیں جب شجر بارش کے بعد
بھر چکے تھے زخم جو پھر کھل اُٹھے
وقت کا دیکھا ہنر بارش کے بعد
پھر چمن میں اُڑتے پنچھی دیکھ کر
ہو گئی پھر نظر بارش کے بعد
میرے دل میں لے رہا ہے کروٹیں
اک نیا عزمِ سفر بارش کے بعد

جس کی بنیادوں میں تھا میرا لہو
ڈھا گئی آندھی وہ گھر بارش کے بعد
آ کے سینے لگ گیا شاہد مرے
وہ مرا رشکِ قمر بارش کے بعد

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

یہ بات سچ ہے کہ مادر ہزار نعمت ہے
مگر پدر کی محبت کا بھی جواب نہیں
زمینِ رب پہ جو سایہ ہے ماں کی ذات اگر
پدر کی اُلفت و حدت کا بھی جواب نہیں
حدیثِ مادر و ماں کا مقام سب سے رفیع
پدر کی شان و لطافت کا بھی جواب نہیں
بے رحمِ ماں کی مثالیں تمام دنیا میں
پدر کی فکر و متانت کا بھی جواب نہیں
گلشن زیست میں ماں کو درخت کہتے ہیں
پدر کی شعلہ ریاضت کا بھی جواب نہیں
ہے ماں کی مدح میں شرق و غرب کے سارے قلم
پدر کی جہد و مشقت کا بھی جواب نہیں
صفی تو خود بھی ہے قائل خلوصِ مادر کا
پدر کے وصف حضانت کا بھی جواب نہیں

سید ذیشان الحسن صفی لاہوری/لاہور

ہمارے شہر میں سب قتل ہوں گے
عقیدے دیکھ کر جب قتل ہوں گے
صدا مظلوم کے حق میں لگا دی
ہمیں معلوم ہے اب قتل ہوں گے
اگر یہ تفرقہ بازی نہ چھوٹی
بڑھے گی ظلمت شب قتل ہوں گے
کوئی توہین کا الزام دھر دے
تمہارے سب عدو تب قتل ہوں گے

یہ دنیا ہے پرانے تیوروں کی
جو رکھتے ہیں نیا ڈھب قتل ہوں گے
ہمیں کافر سمجھتا ہے زمانہ
نجانے شہر میں کب قتل ہوں گے
خدا نے زندگی بخشی تھی لیکن
بنامِ مذہب و رب قتل ہوں گے

ازور شیرازی/

وہ مرے خواب سجانے آئے
میری تقدیر جگانے آئے
اُس پہ کھل جائے حقیقت اُس کی
وہ کبھی آئینہ خانے آئے
اُس سے کہہ دو کہ وہ بن کے ساون
پیاس صحرا کی بجھانے آئے
جب سے بچپن پہ جوانی آئی
اُس کو انداز دکھانے آئے
اک لمحے کے لیے سویا تھا
نیند سے پھر وہ جگانے آئے
سانس لینا بھی ہوا ہم پہ محال
ہم پہ ایسے بھی زمانے آئے
در فصیلوں کے کھلے ہیں کب سے
کوئی زنجیر ہلانے آئے
درد سہنے کا جو یارا نہ رہا
تب کہیں ہوش ٹھکانے آئے
میری بربادی پہ جانے شافی
لوگ کیوں جشن منانے آئے

عقیل شافی/لاہور

ہم ترے شہر سے اس طرح نکالے جائیں
جیسے ہر روز چراغوں سے اُجالے جائیں
اپنی حسرت کہ ساقی و سبو کی مانند
تیری محفل میں کسی روز سنبھالے جائیں

جستجو جاتی رہی جسم بھی تھک ہار گیا
تیرے کہہ دینے سے اب پاؤں کے چھالے جائیں
میری پوشاک پہ کاڑھی ہوئی گل دوزی ہے
یوں نہ یہ داغ سر عام اُچھالے جائیں
خوان اُترے گا مری بھوک مٹانے کے لیے
بس کسی طرح مرے عرش پہ نالے جائیں
عصر حاضر کے یزیدوں کا بھرم توڑیں گے
کاٹے جائیں بھلے زندان میں ڈالے جائیں
میم بتلاؤ کہاں جائیں کے حال کہیں
ہم اگر تیرے بھی دربار سے ٹالے جائیں

مجتبیٰ شہزاد میم/

چھوٹا سا کام کر کے دکھانا پڑا مجھے
اُس چاند کو زمین پہ لانا پڑا مجھے
مانگی تھی اُس نے روشنی میرے وجود کی
یوں بن کے آفتاب بھی آنا پڑا مجھے
لوگوں کو چاہیے تھا مرے عشق کا ثبوت
پھر قتل گاہ شان سے جانا پڑا مجھے
مجھ کو ملی تھی ورثے میں غربت سو اس لیے
خود کو ہی نوچ نوچ کے کھانا پڑا مجھے
میں وادیٔ وفا کا ہنر جان تو گیا
سر کو کٹا کے نیزے پہ لانا پڑا مجھے
وہ چاہتا تھا مجھ سے مری زندگی کی موت
پھر اس لیے بھی خود کو مٹانا پڑا مجھے

خادم علی انجم/لاہور

حسن کو ڈھلتے دیکھا ہے
وقت کو چلتے دیکھا ہے
سب کچھ ہی کھو جاتا ہے
ہاتھ کو ملتے دیکھا ہے
دیوانوں کی آنکھوں سے
چاند نکلتے دیکھا ہے
اس دنیا کا دولت سے
ایمان پھسلتے دیکھا ہے
انجم حسن کے گرگٹ کو
رنگ بدلتے دیکھا ہے

خادم علی انجم/لاہور

اب دل سے اُترتے جاتے ہیں
یادوں سے بھی مٹتے جاتے ہیں
کچھ لوگ جو ریت کی مانند تھے
ہاتھوں سے پھسلتے جاتے ہیں
تھی راہ و رسم ہم سے بھی کبھی
اب لوگ مکرتے جاتے ہیں
کیا قسمت ہے کہ رقیبوں کے
دن رات سنورتے جاتے ہیں
پندار کے سچے موتی سب
لمحوں میں بکھرتے جاتے ہیں
وہ قرب و محبت کے لمحے
خوابوں میں اُترتے جاتے ہیں

سب کھوٹے سکے تول لیے
اب گر کے سنبھلتے جاتے ہیں

اقصیٰ غرشین/کوئٹہ

اُٹھو خوابوں پہ پہرہ دو
کہ جو نیندیں نئے موسم میں اُتری ہیں
وہ ان خوابوں کی قاتل ہیں
جنہیں اپنے لہو کی کھاد سے ہم نے نمو دی تھی
کہ جو گہرے نئے موسم میں بینائی پہ اُترے ہیں
وہ رہزن ہیں وہ قاتل ہیں
اگر چہ وقت کے حاکم نے یہ فرمان بھیجا ہے
کہ جتنی جاگتی آنکھیں بھی پہرے دار ہوں
سب کو سزائے موت دی
مگر یہ جسم مرجائیں
تو جان جسموں کی مٹی سے
ذرا سی دیر میں پھر سے اُٹھیں گی خواب کی فصلیں
چراغوں کی کمانیں ہاتھ میں لے کر
جنوں زادوں کی فوجیں پھر سے نکلیں گی
یہیں پھر حرفِ حق کا معرکہ ہوگا
مگر تب تک
چراغوں کی حفاظت روشنی والوں پہ واجب ہے
بھلے لو کی حفاظت میں تمہارے ہاتھ جلتے ہیں
اُٹھو خوابوں پہ پہرہ دو
اُٹھو خوابوں پہ پہرہ دو

عائشہ غازی/لندن

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

میری سادگی دیکھ

گل نوخیز اختر/لاہور

کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا، آج سوچنے بیٹھا ہوں تو یہ ہولناک انکشاف ہوا ہے کہ مجھے تو اپنے کسی بچپن کے دوست کا نام ہی یاد نہیں۔ کافی دنوں سے میں فیس بک پر اپنے بچپن کے دستوں کو ڈھونڈنے کی پلاننگ کر رہا تھا، آج تھوڑا ٹائم ملا ہے تو میں بُت بنا بیٹھا ہوں، کس دوست کو ڈھونڈوں، گلو، ببا، شیدا، دیمی، ٹیری، جگنو، نادری، لمبو، چکری، تیکی، ٹارزن، ڈھلو، رنگو، شانی، جبی، موٹو، کالو، فوجا، رکھا...... کسی کا بھی اصل نام نہیں پتا، نہ کبھی اصل نام پتا کرنے کی ضرورت پڑی۔

ہمارے اکثر پیارے اس اصل نقل کے چکر میں کہیں گم ہو گئے ہیں، کیا حسین دور تھا جب کوئی کسی کی اصلیت سے واقف نہیں تھا، کسی کو نہیں پتا تھا کہ کون شیعہ ہے، سنی ہے، وہابی ہے، بریلوی ہے یا دیو بندی ہے۔ کسی کی پہچان اس کا مذہب یا فرقہ نہیں تھی، ہم اکٹھے کھیلتے تھے، ایک گلاس میں پانی پیتے تھے، ایک جیسی گالیاں نکالتے تھے اور ایک جیسے ہی گھروں میں رہتے تھے۔ ہر گھر معمولی تھا، ہر مکین بے ضرر تھا۔ ہر دکاندار چاچا جی تھا، ہر عورت خالہ تھی۔ دکانوں پر ''جھونگا'' عام ملتا تھا۔ کسی گھر سے کھانے کی کوئی چیز پلیٹ میں ڈھکی ہوئی آتی تھی تو کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ یہ نیاز ہے، کونڈے ہیں یا ختم کی چیز ہے۔ کسی کو کسی کے پہناوے پر اعتراض نہیں تھا۔ سب بچے عید میلاد النبی کی محفلوں میں بھی کھانے پینے کے لئے موجود ہوتے تھے اور محرم میں بھی کھانے پینے کے لئے موجود ہوتے تھے اور محرم میں شربت کی سبیلوں پر بھی گلاس کے گلاس چڑھا جاتے تھے، کسی گھر میں دیگ پکتی تھی تو عقیدے سے زیادہ چاولوں کی مہک سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ بے فکری ایسی کہ گلی میں چارپائیاں ڈال کر سونے کا رواج عام تھا۔ خوف ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے، ان کا حجم بہت کم تھا، سکائی لیب گرنے کا خوف، سرکٹے انسان کے آنے کا خوف، سیلاب کا خوف، کچی چھت گر جانے کا خوف، امتحان میں فیل ہو جانے کا خوف، بیٹی کی شادی میں کھانا کم پڑ جانے کا خوف۔ یہ خوف بڑوں سے بچوں میں منتقل ہوتے تھے۔ اس دور کے بڑے بھی تو بچے ہی تھے۔ سیاست صرف کونسلر کے الیکشن تک محدود تھی، کونسلر ہی سب سے بڑا سیاستدان تصور کیا جاتا تھا۔ بلدیاتی الیکشن کے دنوں میں کونسلر کسی بڑے سے گھر کے کھلے صحن میں ''جلسے'' منعقد کیا کرتے تھے جن میں حاضرین کو بوتلیں پیش کی جاتی تھیں۔ جلسے کے بعد حاضرین فخر سے بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے چھ بوتلیں پی ہیں۔ ہر گھر کے دروازے کھلے رہتے تھے، بچے کھیلتے ہوئے کسی بھی گھر میں گھس جاتے تھے اور بعض اوقات کھانا بھی کھا آتے۔ بدمعاش وہ ہوتا تھا جس کا گریبان کھلا ہوتا اور وہ اونچی آواز میں بولتا تھا۔ اس دور میں ماسٹر اگر بچے کو مارتا تھا تو بچہ گھر آ کر اپنے باپ کو نہیں بتاتا تھا، اور اگر بتاتا تھا تو باپ اسے ایک اور چھپڑ رسید کر دیتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ''اکیڈمی'' کا کوئی تصور نہ تھا، ٹیوشن پڑھنے والے بچے نکمے شمار ہوتے تھے۔ بڑے بھائیوں کے کپڑے چھوٹے بھائیوں کے استعمال میں آتے تھے اور یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لڑائی کے موقع پر کوئی پستول نہیں نکالتا تھا، صرف اتنا کہنا کافی ہوتا تھا کہ ''میں تمہارے ابا جی سے شکایت کروں گا''۔ یہ سنتے ہی اکثر مخالف فریق کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ کسی گھر میں مہمان آ جاتا تو اردگرد کے ہمسائے حسرت بھری نظروں سے اس گھر کو دیکھنے لگتے اور فرمائشیں کی جاتیں کہ ''پروہنے'' کو ہمارے گھر بھی لے کر آئیں۔ جس گھر میں مہمان آتا تھا وہاں پیٹی میں رکھے، فنائل کی خوشبو میں بھرے بستر نکالے جاتے، خوش آمدید اور شعروں کی کڑھائی والے تکیے رکھے جاتے، مہمان کے لئے دھلا ہوا تولیہ لٹکایا جاتا اور غسل خانے میں نئے صابن کی ٹکیا رکھی جاتی تھی۔

جس دن مہمان نے رخصت ہونا ہوتا تھا، سارے گھر والوں کی آنکھوں میں اداسی کے آنسو ہوتے تھے، بچوں کے لئے تفریح کا واحد ذریعہ Slides المعروف ''گھیسیاں'' ہوتی تھیں۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے قہقہے لگایا کرتے تھے، کسی موت پر پورا محلّہ سوگوار ہو جایا کرتا تھا، گلی میں کولڈ کریم کی شیشیاں بھرنے والا آتا تو محلے کی ساری لڑکیاں ہاتھوں میں آٹھ آٹھ آنے اور تبت سنو کی خالی شیشیاں پکڑے آن موجود ہوتیں۔ یہی صاحب دنداسہ، سرمہ، پت مار پاؤڈر، ٹیلکم پاؤڈر اور اسی اقسام کے دیگر پاؤڈر بھی فروخت کیا کرتے تھے۔ لڑکیاں سٹاپو، ککلی، کوکلا چھپاکی، پرچیاں، اور گڑیوں سے کھیلتی تھیں۔ لڑکے اڈکھڈا، پٹھو گول گرم، لکن میٹی، باندر کلا، بنٹے، چور سپاہی، اونچ نیچ، یسو پنجو، چڑی اڈی کاں اُڈا، کیرم بورڈ اور لڈو کے شیدائی تھے، تاش کھیلنے والے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔

شادی بیاہوں میں سارا محلّہ شریک ہوتا تھا۔ شادی غمی میں آنے جانے کے لئے ایک جوڑا کپڑوں کا علیحدہ سے رکھا جاتا تھا۔ جس گھر میں شادی ہوتی تھی ان کے مہمان اکثر محلے کے دیگر گھروں کی بیٹھکوں میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ کسی کسی گھر میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہوتا تھا اور سارے محلے کے بچے وہیں جا کر ڈرامے دیکھتے تھے۔ دکاندار کو کھوٹا سکہ چلا دینا ہی سب سے بڑا فراڈ ہوتا تھا، گھروں میں صرف چوریاں ہوتی تھیں، ڈاکے نہیں پڑتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب امی ہوتی تھی یا ماں۔ می، مما یا مام ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھیں، والد صاحب کو بھی ابو، بابا اور ابا جی کہا جاتا تھا، کوئی پاپا، ڈیڈی، ڈیڈ نہیں ہوتا تھا...... سر شام ہی لوگ سونے کی تیاریاں کرنے لگتے تھے اور اگلے دن ہشاش بشاش اٹھتے تھے، کسی نے شوگر، ہیپاٹائٹس، ایڈز، ڈینگی، بلڈ پریشر، ڈپریشن، کرونا وغیرہ کا نام تک نہیں سنا تھا، سب کو نیند آتی تھی اور خوب آتی تھی۔ ناشتے اور رات کے کھانے پر سب اکٹھے بیٹھتے تھے۔ ان دنوں موبائل نمبر نہیں ''پی پی'' نمبر ہوتا تھا یعنی ہمسائے کا ٹیلی فون نمبر۔ مصروف سے مصروف بندہ بھی شام کو فارغ ہو کر گھر لوٹتا تھا، تب مصروف ہونے کا رواج بھی نہیں پڑا تھا۔ آج میں اس دور کے دوستوں کو ڈھونڈنے بیٹھ گیا ہوں۔ جس دور کا سکہ بھی ناپید ہے۔ مری سادگی دیکھ......!!!

خالد علیم کا شعری سفر

نوید مرزا/لاہور

خالد علیم اُردو کے جانے پہچانے شاعر اور ادیب ہیں۔ان کا نام اُردو کے جدید ادب میں انتہائی معتبر اور اہم سمجھا جاتا ہے۔انہوں نے شعری و نثری ادب دونوں میں یکساں مقبولیت اور مقام حاصل کیا۔اُردو شاعری میں ان کے تین مجموعے ''شام،شفق،تنہائی''، ''بغداد آشوب''، ''تمثال'' اور نعتیہ مجموعہ ''محامد محمد ﷺ'' جب کہ نثری ادب میں ان کے افسانوی مجموعے ''مردہ آنکھ میں زندہ چہرہ'' 2010ء،''اردو شاعرات کی نعت گوئی 1995ء''،''نعتیہ موضوعات پر مضامین،کلیات زاہدہ خاتون اور ناول ''دائرے میں قدم'' کی اشاعت نے انھیں شہرتِ دوام بخشی ہے۔ انھوں نے نہ صرف شعری و نثری ادب میں قدر داں قدر خدمات انجام دی ہیں بلکہ بحیثیت مدیر دو اہم ادبی جریدوں سہ ماہی ''سیارہ'' اور ماہنامہ ''فانوس'' (تاحال) کی کامیابی ادارت بھی کی ہے۔

خالد علیم کی شاعری میں زندگی کے سارے رنگ موجود ہیں۔ان کے ہاں موضوعات کی فراوانی ہے۔محبت کے موضوع سے لے کر عصری مسائل تک اور ہجر و وصال کے موضوع سے لے کر جنگ اور امن تک وہ ہر موضوع پر طبع آزمائی فرما چکے ہیں۔خالد علیم کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں اور وہ ہر سمت شعری اظہار کرتے ہوئے کامیاب و کامران دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی تمام معروف اصناف حمد،نعت، رباعی،غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کا مجموعہ ''تمثال'' رُباعیات پر مشتمل ہے۔رباعی کے حوالے سے ان کی بلند فکری اور سوچ انھیں ایک اعلیٰ درجے کے رباعی گو کی حیثیت سے متعارف کرواتی ہے۔خالد علیم کی رباعیات اس صنف کے حوالے سے یوں بھی اہم ہے کہ وہ رباعی کے مروجہ اوزان سے پوری طرح واقف ہیں اور رباعی کو کسی مقام پر بھی قطعہ نہیں ہونے دیتے۔یوں وہ قطعہ اور رباعی کے بنیادی فرق اور اوزان سے پوری طرح واقف ہیں۔

خالد علیم کا مجموعہ غزلیات ''شام،شفق،تنہائی'' چند برس قبل منظر عام پر آیا۔ان کی غزلیں جدید شاعری کے پورے تقاضے پورے کرتی ہیں لیکن جدیدیت کی لہر نے انہیں روایت سے کنارہ کشی کی طرف مائل نہیں کیا بلکہ ان کی غزل میں روایت کا احترام بھی پوری طرح موجود ہے۔لہٰذا جدید و قدیم کے امتزاج سے ان کی غزل اپنے پورے تخلیقی وجود کے ساتھ قارئین علم و ادب کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

خالد علیم کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس میں عقیدت کی خوشبو صاف اور شفاف لہجے میں محسوس ہوتی ہے۔ان کا نعتیہ مجموعہ ''محامد محمدؐ''نعتیہ شاعری میں ایک اہم حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔نعت لکھنا ایک بہت سعادت ہے اور خالد علیم نے جس خوبصورتی اور سلیقے سے نعت گوئی کی ہے اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ان کی دیگر شاعری کی طرح نعت گوئی میں بھی ان کا اسلوب منفرد اور بے مثال ہے۔

خالد علیم کی نثری تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے ان کے افسانے ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''مردہ آنکھ میں زندہ چہرہ'' 2010ء میں منظر عام پر آیا۔خالد علیم اپنے افسانوں میں ایک سچے تخلیق کار کے روپ میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ان کے افسانے حقیقت سے قریب تر ہیں اور یہ ساری کہانیاں ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے واقعات سے اخذ کی گئی ہیں۔

خالد علیم کا ناول ''دائرے میں قدم'' چند برس قبل منظر عام پر آیا تھا جس میں مصنف نے لفظوں کی اعلیٰ بنت کاری سے کہانی کو بڑی خوبصورتی سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔اس ناول کی کہانی بھی قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔کہانی میں حقیقت کا رنگ غالب ہو تو پڑھنے والا اُس کی گرفت میں چلا جاتا ہے اور یہی خوبی ہمیں ''دائرے میں قدم'' میں محسوس ہوتی ہے۔

خالد علیم کا شعری و نثری سفر آج بھی پوری توانائی سے جاری ہے۔ان کی کئی کتابیں تکمیل پا چکی ہیں اور کئی زیر تعلیم ہیں۔ان کی شعری کلیات بھی زیر ترتیب ہے جو اُن کے اب تک شائع ہونے والے تمام شعری مجموعوں پر مشتمل ہے۔دعا ہے کہ اُن کا یہ ادبی سفر تادیر جاری رہے۔آمین

سائیں، صاحب

عامر بن علی/ جاپان

معانی و مطالب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر الفاظ کا اپنا سحر ہوتا ہے۔لفظوں کا ترجمہ تو پھر بھی ممکن ہے، ان کے صوتی اثرات کے تراجم کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ دنیا بھر کی تمام زبانیں ایسے الفاظ کے خزانوں سے لبریز ہیں۔ پاکستانی زبانوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔لسانی اعتبار سے پاکستان بڑا متنوع اور امیر ملک ہے۔ اس جہانِ آب وگل میں چند ہی ممالک ایسے ہوں گے جہاں ہماری طرح سو کے لگ بھگ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہماری دھرتی کے لوگوں کا یہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے بیرونی دنیا سے آنے والوں کے ساتھ ہمیشہ وسیع المشربی کا مظاہرہ کیا۔کبھی کسی گروہ کو مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنی زبان و ثقافت سے دستبردار ہو جائے۔ اسی سبب سے یہ لسانیاتی قوس وقزح وطنِ عزیز میں وجود میں آئی ہے۔ ثقافتی رنگا رنگی کے علاوہ اس خطہ ارض کے لوگوں نے خارجی زبانوں کے بارے میں کبھی کوئی تعصب نہیں رکھا ہے۔کسی بھی زبان کا کوئی بھی لفظ اگر دل کو بھایا، بامعنی و بھرپور لگا تو اسے فوراً اپنا لیا۔عرب جب سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ اسلام اور عربی زبان بھی لے کر آئے تھے۔ اسلام کو من وعن وادیٔ سندھ کے اکثر لوگوں نے اپنا لیا۔عربی زبان نے بھی اس خطے کی مقامی زبانوں پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ عربی لغت سے ہمارے روزمرہ میں آنے والا ایسا ہی ایک لفظ صاحب ہے۔ یہ لفظ جب پنجاب پہنچا تو سیدھا پنجابیوں کے دل میں اُتر گیا۔صوفیاء کرام نے صاحب کا لفظ خدائے بزرگ و برتر کے لیے استعمال کیا ہے۔

عظیم صوفی شاعر سلطان باہو نے جیسے فرمایا:

جے باہو صاحب سر منگے ہرگز ڈھل نہ کریے ہو

ایک اور معروف صوفی بزرگ شاعر نے دیکھیں کس خوبصورتی سے صاحب کو مالک کائنات کے لیے استعمال کیا ہے۔

چنگی آں کہ مندی آں
صاحب تیری بندی آں

سکھ مذہب کے پیروکاروں نے اس لفظ کو تقدیس کے ایک نئے مرتبے پر فائز کر دیا۔گرونانک کی تعلیمات پر مبنی اس دھرم نے ہر مقدس نام و مقام کے ساتھ ''صاحب'' کا لاحقہ لگا دیا ہے۔ جیسے ننکانہ صاحب، گوردوارہ صاحب، گرنتھ صاحب، پنجہ صاحب آپ نے یقیناً سنے ہوں گے۔ سندھی زبان کا لفظ سائیں، پنجابی زبان میں عربی سے آئے لفظ صاحب کی چوٹ کا ہے۔ ویسا ہی مقدس اور خوبصورت ہے۔ صاحب کی طرح سائیں بھی پروردگار عالم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سائیں اور صاحب کا ذکر ایک ساتھ کرنے کی وجہ خوبصورت لہجے کے مقبول شاعر حسن عباسی کے دوحمد یہ کلام پر مشتمل مجموعے ہیں۔جن میں ایک کا نام ''صاحب'' اور دوسرے کا نام ''سائیں'' ہے۔حسن عباسی سے میری دوستی کا سفر دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔مگر باطن کا سفر تو ہر انسان کا الگ الگ ہی ہوتا ہے۔ باطنی سفر میں تو انسان اگر کسی کو شریک سفر بنانا بھی چاہے تب بھی ہم سفر نہیں بنا سکتا۔ یہ ہر فرد کی اپنی تقدیر اور توفیق ہوتی ہے۔ خالق و مالک کائنات کی ثناء بیان کرنا اور اتنی حمد کہنا کہ شعری مجموعہ بن جائے۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ سائیں اور صاحب اتنے خوبصورت نام ہیں کہ سیدھے دل پر اثر کرتے ہیں۔عربی زبان میں جس طرح لفظ مولا کے اٹھارہ مطالب و معنی بیان کیے جاتے ہیں، جن میں بیک وقت دوست، ساتھی سے لے کر آقا و خادم تک بات جاتی ہے، بالکل ایسے ہی الفاظ سائیں اور صاحب ہیں۔ان سے ویسی ہی تقدیس جھلکتی ہے جیسی مولا کے لفظ سے اور مقدس لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ سندھی خواتین اپنے خاوند کو نام لے کر نہیں بلاتی ہیں۔ بلکہ سائیں کہہ کر مخاطب ہوتی ہیں۔ پنجابی میں سائیں مالک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مجذوب شخص کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔البتہ سرائیکی زبان میں لفظ سائیں سندھی زبان جیسی گہرائی، وسعت اور تقدس رکھتا ہے۔شوہر کو سرائیکی عورتیں بھی سائیں کہہ کر پکارتی ہیں۔ بلکہ ''میڈا سائیں'' کے عنوان سے ایک مقبول کتاب بھی شائع ہوئی تھی جو سرائیکی وسیب سے تعلق رکھنے والے ایک سیاست دان کی سابق اہلیہ نے تحریر کی تھی۔گرچہ سائیں اور صاحب مجازی خدا کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔مگر ان الفاظ کا اصل مقام تو خدائے وحدہ لاشریک کی ذات پاک ہی ہے۔حسن عباسی کو حمدیہ کلام کے دونوں مجموعوں کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر خوشی اس بات کی ہے کہ میرے تخلیق کار دوست نے سائیں اور صاحب لفظ کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ رمضان المبارک کے بابرکت ایام میں الوہیت کی شعری نغمگی سے لبریز یہ دونوں کتابیں اہل ایمان کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہیں۔

ارشادنامہ

لبنیٰ صفدر/لاہور

ان دنوں موصول ہونے والی کتب میں سے ایک نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستانِ حیات ہے جن کے والدین کا سایہ تقسیم ہند سے قبل ہی ان کے سر سے اُٹھ گیا جب وہ محض اُس عمر میں تھے جب والدین کی محبت و شفقت کی ضرورت زندگی کی ہر ڈگر پر رہتی ہے لیکن زندگی کی ڈگر کی مسافت پدر کا ہاتھ پکڑے بغیر طے کرنا اُن کا مقدر تھی۔ اپنے بھائی کے ساتھ زندگی گزاری اور تقسیم ہند پر پاکستان تشریف لائے۔ قارئین آپ کو میری طرح ہی خوشگوار حیرت ہوگی کہ اس بچے نے اپنی بے انتہا محنت اور زندگی کی جدوجہد میں کامیابی سے نہ صرف اپنا سفر طے کیا بلکہ چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے کی منزل پر پہنچ گیا۔ میری مراد چیف جسٹس آف پاکستان جناب ارشاد حسن خان سے ہے جن کا "ارشاد نامہ" کئی دن سے میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ معاون سے چیف جسٹس بننے کی یہ داستان انتہائی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنے کی جرات اور آگے بڑھنے کا حوصلہ بیان کرتی یہ کتاب یا آپ بیتی ایک کتاب نہیں ایک موٹو ہے ہم سب کیلئے کہ خدا نے ہمیں وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں کہ ناممکن کا لفظ ہمیں اپنی ڈکشنری سے خارج کرنا ہوگا۔

ارشاد حسن خان صاحب کی زندگی کی یہ داستان اُن کی قائداعظم سے بے پناہ عقیدت و محبت سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں سے متاثر ہو کر انہوں نے پیشہ وکالت سے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ تصور کیجئے کہ جس کی زندگی کی منزل کا آغاز ہی قائداعظم جیسی عظیم، پروقار اور بلند ہمت ہستی سے متاثر ہو کر سفر شروع کرنے کا ہو یقیناً اعلیٰ منزل تک پہنچنا اس کے دستِ قسمت میں خالق نے رقم کر دیا کیونکہ منزل انہی کو مبارک ہوتی ہے جو سفر کے خار اپنی پلکوں سے چننا جانتے ہیں۔ میں ارشاد نامہ کے ہر صفحہ کے اُلٹنے کے ساتھ ایک عجیب خوشی بھری حیرت میں مبتلا ہوتی جا رہی ہوں، ہر صفحہ منزل کی جانب ایک قدم کی مکمل داستان ہے۔ ارشاد حسن خان کی زندگی بھرپور جدوجہد کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ رہے، انجمن حمایت اسلام لاء کالج میں بطور لیکچرار کام کیا، لاہور ہائیکورٹ کے جج کے عہدہ پر تعینات رہے۔ فیڈرل سیکرٹری قانون و پارلیمانی اُمور، بانی فیڈرل جوڈیشل اکیڈمی، جج سپریم کورٹ، چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ، چیف جسٹس سپریم کورٹ جیسے اعلیٰ ترین بے شمار عہدوں پر فائز رہے۔ دُنیا کے تقریباً ہر ملک کی عدالتی کانفرنسوں میں بھی شریک رہے۔ پاکستانی عدلیہ نے عدالتی نظام کے بہترین بنانے کے حوالے سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اور یوں ایک مضبوط ریاستی ادارہ بنا۔ کثیر تعداد میں ججز نے اپنے فرائض بخوبی نبھائے۔ لیکن کم کم ہی ایسے سامنے آئے جنہوں نے زندگی کے تجربات کے نچوڑ کو کتابی شکل میں ترتیب دیا ہو۔ اگر آپ بیتی سے یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ یہ ایک آسان صنف ہے کیونکہ اس میں ادب کے لوازمات کا خیال رکھنے سے ہٹ کر لکھاری اپنی زندگی کے واقعات و تجربات کو من و عن لکھ کر اپنا فرض ادا کر سکتا ہے تو میں اس سے زیادہ اتفاق نہیں کرتی کیونکہ اپنی زندگی کے سچ کو آئینے میں دیکھنے اور لوگوں کے سامنے بیان کر دینے کا حوصلہ بھی ہر ایک میں کہاں ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے ابتدائی حالات، تلاش روزگار اور پھر ملازمت کے احوال کو جہاں نہایت عمدہ اسلوب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہیں شادی کا باب بھی خوب ہے۔ شادی کا احوال اتنا دلچسپ ہے کہ پورا پڑھے بغیر آپ کتاب چھوڑ کر نہیں اُٹھ سکتے۔ جگہ کی کمی کے باعث سارا قصہ تو نہیں لکھ سکتی لیکن آخر میں کچھ جملوں کی نرماہٹ اور ان سے جھلکتی بے پناہ محبت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کو سناؤں۔

مرد کے لئے یہی کافی ہے کہ اُس کی بیوی اُسے پسند کرتی ہے پھر وہ جی جان سے اپنے فرائض منصبی پورے کرتا ہے یہ میاں بیوی کے درمیان ایک "مان" ہوتا ہے کہ اُس کا جیون ساتھی اُسے پسند کرتا ہے اُس کے دل میں صرف اُس کی قدر ہے اور جب وہ کسی مشکل میں ہو تو جھک کر دل میں اُس قوت کو دیکھ لیتا ہے پھر اس کا حوصلہ بلند اور یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ کمرہ عدالت میں سخت ترین فیصلے قلمبند کرنے پر مجبور ایک جج کے نہیں ایک نرم دل اور رشتوں کی اہمیت سے واقف ایک انسان کے ہیں جس کے سینے میں دل دھڑکتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی ارشاد نامہ میں آپ کو مختلف واقعات پڑھتے ہوئے صاحب کتاب کے ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ مرزا غالب کا شعر لکھتے ہیں کہ

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

جگہ جگہ طنز و ظرافت کے نشتر بھی چلائے ہیں اور جس مزاح سے لوگوں کو محظوظ بھی کرتے اور خود بھی ہوتے ہیں یہ ایک زندہ دل انسان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ملک صاحب نے کہا آپ مجھے بہت شریف اور اچھے لوگ لگے ہیں اُنہوں نے ہمارے شریف ہونے پر اتنا زور دیا کہ میں نے اُنہیں چھ ماہ کا کرایہ ایڈوانس چیک کی صورت میں ادا کر دیا۔ بعد میں جب اُس شخص کو معلوم ہوا کہ میں وکیل ہوں تو لاکھ کوشش اور منت سماجت کے باوجود اُس نے مجھے گھر نہیں دیا۔

پیشہ وارانہ، معاشرتی تعلقات پر مبنی ابواب انتہائی دلچسپ ہیں۔ جگہ کی کمی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بہت سے دلچسپ واقعات کو آپ تک پہنچایا جا سکے لیکن میں وثوق سے کہتی ہوں کہ ارشاد نامہ جب آپ کے ہاتھ میں ہوگی تو آپ اس کو ایک نشست میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ بہت سے عدالتی فیصلوں کی حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ ظفر علی شاہ کیس کو تفصیلاً" بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ان دنوں میں کسی کتاب کو پڑھنے کا ارادہ کر رکھا ہے تو "ارشاد نامہ" آپ کے لئے اچھی چوائس ہو سکتی ہے۔ سادہ اور عام فہم داستانِ حیات آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی لیکن ساتھ ہی ساتھ زندگی بسر کرنے کے ہنر بھی سکھائے گی۔ زندگی کے سفر میں یہ ایک اور مشعل ہے جس نے اپنے حصے کا اُجالا کر دیا ہے۔

شاعری

انٹرویو: حمادنیازی

چاند کتنا حسین لگتا ہے
تیری رعنائیوں سے جلتا ہے
تو بھی مجبور ہے سمجھتا ہوں
دل تو پاگل ہے کب سمجھتا ہے
تیری یادوں کا نیلگوں سایا
ہر قدم ساتھ ساتھ چلتا ہے
رات کو خواب میں تم آئے تھے
آج سارا ہی گھر مہکتا ہے
تیری آنکھوں نے یوں کیا گھائل
درد اک پل نہیں ٹھہرتا ہے
جب سے تو آ بسا ہے خوابوں میں
تیرے کھونے کا ڈر سا رہتا ہے
کوئی تجھ سا نہیں ہے دنیا میں
میں نہیں سارا شہر کہتا ہے

عامر بن علی/ جاپان

محبت چھوگئی دل کو

پرندوں کے حسیں نغموں کی لوچن
بڑھتی جاتی ہے
مہک ایسی کہاں ہوتی تھی پھولوں میں کبھی پہلے
زمیں کے رنگ اجلے لگ رہے ہیں
اس لیے شاید
کہ ساون رت میں سارے داغ دھبے
دھل ہی جاتے ہیں
مگر یوں زندگی سے پیار پہلے تو کبھی کب تھا
طبیعت میں عجب مستی ہے
دنیا اچھی لگتی ہے
ہمارے ہر طرف یہ اجنبی خوشبو جو پھیلی ہے
تو لگتا ہے
محبت چھوگئی دل کو
محبت ہوگئی جاناں۔۔۔۔!

عامر بن علی/ جاپان

دے ایسا انوکھا مجھے کردار مصنف
تا کہ یہ کہانی بنے شہکار مصنف
معلوم نہیں اصل میں ہے کس کی وراثت
ہر ایک کہانی کے ہیں دو چار مصنف
آغاز میں ہی مرکزی کردار کو مارا؟
بے کار کہانی کے اے بے کار مصنف
گھربار لٹایا تو یہ کردار ہے پایا
کیوں تم نے دکھایا مجھے غدار مصنف؟
میں ایک تھا اور سامنے لشکر تھا عدو کا
تم دیتے مرے ہاتھ میں تلوار مصنف
ہر بار مجھے غم کے ہی کردار میں ڈھالا
اس بار کوئی طربیہ کردار مصنف
اس کوٹھڑی کے بس یہی میراث ہے صاحب
دو چار کتابیں ہیں اور اخبار مصنف

صاحب جمالی/جعفرآباد، بلوچستان

ابھی کہانی میں بچ نکلنے کے راستے ہیں
ابھی تو گنتی کی دسترس میں یہ حادثے ہیں
ہمارے ہاتھوں میں نامرادی کی چاپیاں ہیں
ہم اپنے کمرے کو اک اذیت سے کھولتے ہیں
یہ شب کو گلیوں میں کون پھرتا ہے سر جھکائے
چراغ طاقوں میں کس کے حصے کا اونگھتے ہیں
کسی طرح سے انہیں حقیقت میں کھینچ لائیں
ہم اپنی آنکھوں کے سبز خوابوں کو اینٹھتے ہیں
وجودِ خاکی کا رنگ و روغن اُتر چکا ہے
سو، اپنے حصے کا جتنا جینا تھا جی چکے ہیں
کئی زبانوں نے چکھ لیا ہے نیا زمانہ
کئی زبانوں پہ اب بھی ماضی کے ذائقے ہیں
ملال ہوتا ہے جن کا ٹہنی کو آج قاسم
وہ خشک پتے ہوا نے کب کے اُڑا دیے ہیں

قاسم رضا مصطفائی

کسی آرزو کے جہان میں
میں تو بس رہا ہوں گمان میں
اُسے دوستوں کی کمی نہیں
ہو مٹھاس جس کی زبان میں
جو تلاش ہو مجھے ڈھونڈنا
کسی راستے کے نشان میں
نظر آ رہی ہے لکیر سی
مجھے حسرتوں کے مکان میں
چھپی محنتوں میں ہیں عظمتیں
بڑی راحتیں ہیں تھکان میں
اُسے خوف سے رہا واسطہ
بڑا تیز تھا جو اُڑان میں
وہی گفتگو تو ہے دل نشیں
رہے سادگی جو بیان میں

فاروق احمد فاروق/شادیوال گجرات

انٹرویو: علی کمیل قزلباش

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو بطور شاعر ادیب، محقق ومترجم تو ایک زمانہ جانتا ہے، درسگاہوں سے متعلق افراد انہیں ماہر تعلیم اور فارسی دانی کے حوالے سے بھی خوب پہنچانتے اور معترف ہیں۔قارئین ارژنگ کو مگر میں ان کا تعارف ایک ایسے سکالر اور عالم کے طور پر کروانا چاہتا ہوں ادب کے شعبے میں جن کے ہم پلہ نقطہ دان وطن عزیز میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ایک ایسے شفیق استاد جو تدریس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔میری خوش بختی ہے کہ میں نے ایک سال ان سے فارسی زبان و ادب پڑھا اور قارئین ارژنگ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے مکالمے کے لئے ہمیں وقت دیا۔ڈاکٹر علی کمیل قزلباش جیسے ہمہ جہت تخلیق کار اور دانشور پاکستان کی شان ہیں اور ادب کی آبرو ہیں۔

ارژنگ: گفتگو کا آغاز آپ کی ابتدائی زندگی سے کرتے ہیں۔کہاں پیدا ہوئے؟اور بچپن کہاں گزرا؟ اپنے سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے۔

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میری پیدائش بلوچستان کے علاقے لورالائی کی ہے۔پرورش اور ابتدائی تعلیم بھی لورالائی میں ہی مکمل ہوئی۔میرے والد محنت کش تھے۔ایف سی ملیشیا میں سپاہی بھرتی ہوئے اور اس سے پیشتر وہ مزارع تھے۔پہلے پہل ہم گاؤں میں رہتے تھے۔مگر جب والد صاحب نے ایف سی میں نوکری شروع کر دی تو ہم شہر میں آگئے۔تعلیم کا آغاز سرکاری سکول میں کیا جسے عرف عام میں ٹاٹ والا سکول کہتے ہیں۔میٹرک کے بعد میں نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔مگر امتحان کے دوران ایک طلبہ تنظیم نے ہنگامہ آرائی کی اور بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔حکومت نے تین سال کے لئے ہمارے شہر سے امتحانی مرکز ہی ختم کر دیا۔نتیجتاً مجھے پرائیویٹ ایف اے کرنا پڑا۔اس کے بعد بی اے بھی پھر پرائیویٹ ہی کیا۔سکول میں میرا ایک کلاس فیلو جوتوں کا کام کرتا تھا۔مجھے اس نے دوست ہونے کے ناطے اس کام میں شمولیت کی دعوت دی۔میں نے جوتے بنانے سیکھے اور کافی عرصہ جوتے بناتا رہا۔ایف ایس سی میں مجھے محسوس ہوا کہ پڑھائی اور جوتے بنانے کا کام اب ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ہیں۔لہٰذا میں نے ادبیات کی محبت میں پاپوش سازی چھوڑ دی۔

ارژنگ: تخلیقیت کیا ہے؟ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: تخلیقیت اصل میں ایک خدائی صفت ہے۔مجھے عرض کرنے دیجئے کہ

این سعادت بزور بازو نیست

میری نظر میں تخلیقیت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے انکشاف کے ذریعے کائنات کے انکشاف کی طرف بڑھتا ہے۔تخلیق کار چاہے ادب کے شعبے سے تعلق رکھتا ہو یا پھر کسی بھی اور شعبے سے، یہ ایک کلمہ ہے جو پروردگار کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔یہ ایک قدرتی صلاحیت ہے مگر ایک اچھا تخلیق کار وہ ہے جو مطالعہ کر کے ،الفاظ ومعنی پر دسترس حاصل کر کے بہتر انداز میں اپنے خیالات واحساسات کو اور نظریات کو تراش خراش کر کے بہتر انداز میں پیش کرتا ہے۔بصورت دیگر صلاحیت ہونے کے باوجود اور فکر کا حامل ہو کر بھی اگر کوئی محنت اور لگن سے تخلیقی کام اور مطالعہ نہیں کرتا تو وہ بڑا فن تخلیق نہیں کر سکے گا۔

ارژنگ: کوئی بے آسودہ لمحہ؟تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میں سیلف میڈ قسم کا آدمی ہوں۔تمام عمر محنت میں گزری ہے۔میری تو عادت رہی ہے کہ اپنی آسودگی دوسروں پر قربان کر دوں۔کامیابیاں اللہ تعالیٰ نے بہت دیں جسے میں نے ہمیشہ سفر میں سنگ میل ہی سمجھا جس سے آگے بڑھنا ہے۔مجھے سب سے زیادہ آسودگی تب محسوس ہوتی ہے جب کوئی اچھی تحریر پڑھتا ہوں۔میرے نزدیک آسودہ ترین عمل مطالعہ ہے۔شاعری میں خصوصاً جب شعر کی پرتیں اور گرہیں آپ پر کھلتی ہیں تو جو لطف محسوس ہوتا ہے وہ میں نے اور کہیں محسوس نہیں کیا۔

ارژنگ: محسوس ہوتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میں عرض کروں کہ کتاب بینی اور کتاب خوانی کا رجحان ہمارے ہاں شروع سے ہی نہیں ہے۔سچ تو یہ ہے کہ کتاب کا رواج یہاں پہلے بھی کم ہی رہا ہے۔ہاں یہ درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے مزید کم ہو گیا ہے۔پڑھنے والے تو اب بھی پڑھتے ہیں مگر مجموعی طور پر ماحول مطالعہ کرنے کا نہیں ہے۔میں دوٹوک کہہ دوں کہ ہمارے اساتذہ جو پڑھاتے ہیں وہ خود بھی نہیں پڑھتے۔میں اگر خود نہیں پڑھوں گا تو بچوں کو کیا پڑھاؤں گا، بلکہ عالم تو یہ ہے کہ جو اساتذہ کتابیں لکھ رہے ہیں وہ بھی کتابیں نہیں پڑھتے ہیں۔میں اسلام آباد کے ایک مصنف کو جانتا ہوں جو تیں ،پینتیس کتابیں لکھ چکے ہیں، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انہوں اب تک اتنی کتابیں خود نہیں پڑھی ہوں گی۔مطالعہ کا رجحان تعلیمی اداروں سے پیدا ہوتا ہے۔

ارژنگ: مشاعروں پر جو زوال آیا ہوا ہے اس کی وجہ کیا سمجھتے ہیں؟ کون ذمہ دار ہے اس صورتحال کا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: مشاعرہ شاعری کی ترویج کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہا ہے۔ موجودہ دور میں مجھے ایک مصنوعی پن کا راج اسی ضمن میں نظر آتا ہے۔ مشاعرہ جو تھا، وہ مشاہرہ بنتا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں مشاہرہ معاوضے کو کہتے ہیں۔ شاعر حضرات وہیں جاتے ہیں جہاں اچھے معاوضے کی توقع ہوتی ہے۔ میڈیا کی وجہ سے کوریج اور شہرت اس بابت اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مشاعروں پر زوال آنے کی وجہ یہ ہے کہ جو اصل مقصد اور ہدف تھا وہ چلا گیا، اب خودنمائی اور خود پسندی کی ایک صورت ہے۔ فنی اور فکری لحاظ سے سطحیت مشاعروں میں غالب آ گئی ہے۔

ارژنگ: ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: ذاتی تجربات ومشاہدات بہت ہی زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی تخلیق کار کے فن پر۔ ذاتی واردات ہو یا پھر معاشرتی تجربہ، اسی بنیاد پر ہی وہ اظہار سکے گا۔ تجربے اور مشاہدے کے بغیر تو تخلیقی عمل بہت ہی سطحی اور غیر حقیقی ہوگا۔

ارژنگ: آپ پاکستان میں فارسی زبان کے صفِ اول کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ایران سے بھی آپ نے ادبیات کی تعلیم حاصل کی ہے، تہران یونیورسٹی میں گزرے دنوں کے بارے میں قارئین کو کچھ بتائیے؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: تہران یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں اکثر ادبی محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ گرچہ پی ایچ ڈی کا اپنا نصاب کافی ہوتا ہے مگر میں ادبی انجمنوں میں مسلسل جایا کرتا اور اس کے علاوہ میں نے انہی دنوں میں کافی تراجم بھی کیے۔ غیر ملکی طالب علموں کا تہران یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہے مگر میں اجازت لے کر ایرانی طلباء کو پڑھانے والے ان اساتذہ کی تدریس سے بھی استفادہ کرتا جو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ بلکہ حال ہی میں وفات پانے والے قیصر امین پور سے میری بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی نظموں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں انہوں نے میری بڑی مدد کی تھی۔ تہران یونیورسٹی سے میں نے پڑھا ہی نہیں بلکہ ان اساتذہ سے سچی بات یہ ہے کہ پڑھانا سیکھا۔ تحقیق کیسے کی جاتی ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا تھیسز علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک پر تھا۔ 2005 میں واپس پاکستان آ گیا۔ بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تدریس کی دعوت دی جسے میں نے قبول کر کے شعبہ فارسی جوائن کر لیا۔

ارژنگ: پاکستان میں تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میں نے بلوچستان یونیورسٹی میں فارسی کے علاوہ اردو کے شعبے میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ بہت اچھا تجربہ تھا۔ فرقہ ورانہ قتل وغارت کی وجہ سے مجھے کوئٹہ چھوڑنا پڑا۔ یہ جبری ہجرت تھی۔ جو ہمارے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔ 2012 میں اسلام آباد شفٹ ہو گیا۔

ارژنگ: ادب کے حال اور مستقبل سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش:۔ جی! مطمئن رہنا چاہیئے، چونکہ یہ تو نور کا دریا ہے۔ جو ہمیشہ سے بہہ رہا ہے اور مستقبل بھی بہتا رہے گا۔ اچھا لکھنے والے بڑے لوگ کل بھی تھے، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ادب کو کبھی زوال آئے، گراف اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ ادب پر کل بھی عروج تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اردو ادب کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے۔ اس کا مستقبل روشن ہے۔

ارژنگ: کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا پھر اندرون سے؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: سخن ور کو معاشرے اور خارجی ماحول سے تحریک ضرور ملتی ہے مگر فنکار اس کے اندر موجود رہتا ہے۔ اگر اس کے اندر وہ حساسیت، فنکارانہ حسن پرستی اور تخلیقی صلاحیت موجود نہ ہو تو وہ تب تک باہر کی رنگا رنگی اور تحریک محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ رومی نے کہا ہے کہ

زندہ معشوق است وعاشق مردہ ای

عاشق کو تو معشوق ہی جگاتا ہے کہ بھئی مجھ میں حسن ہے اور تو میرا عاشق ہو جا۔ اسی طرح شاعر اور ادیب کو بھی باہر کا حسن متاثر کرتا ہے مگر رومی کے شعر کے مصداق عشق کرنے کی صلاحیت تو موجود ہونی چاہیئے۔ سورج کے غروب ہونے کے منظر کی ہی مثال لے لیں، اس منظر کا اثر فنکار پر الگ اور ایک عام انسان پر مختلف ہوگا۔

ارژنگ: آغا جان! آپ نے لکھنے کا آغاز کب کیا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میں میٹرک، ایف ایس سی کے دنوں سے لکھ رہا ہوں۔ ابتداء میں گھر والوں نے حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ خصوصاً بڑے بھائی روکتے تھے کہ پڑھائی پر توجہ دیا کرو اور شعر وسخن سے تمہاری تدریس کا حرج ہوگا۔ میں چھپ چھپ کر ادبی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ رات کو کمرے میں لالٹین جلا کر پڑھتا تھا تا کہ اہل خانہ کو خبر نہ ہو۔ والدہ کہتی تھی کہ اس طرح آنکھیں خراب کر بیٹھو گے۔ کبھی کبھی گھر والے چھاپہ بھی مارتے تھے کہ یہ چھپ کر کہیں پڑھ تو نہیں رہا۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ ان دنوں میرا ذریعہ معاش فوٹو گرافی تھا۔ اصلاح سخن کے لئے میں نے اپنی تحصیل دکی کے کالج پرنسپل کو خط لکھا اور اپنی شاعری انہیں بھجوائی۔ انہوں نے تنقید بھی کی مگر حوصلہ افزائی اور اصلاح بھی دیتے رہے۔ انہی دنوں ایک ادبی پرچے میں میری شاعری شائع ہوئی جس پر لوگوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے بڑے بھائی کو جب وہ پرچہ دکھایا تو انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ اور پھر

میری حوصلہ افزائی کرنا شروع کردی۔

ارژنگ: ادب میں سوشل میڈیا کے کردار کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: سوشل میڈیا ادب کے فروغ میں بہت اہم اور اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔اس نے کئی نئے دریچے کھول دیئے ہیں۔ادب کی ترویج کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا نے تاریخ سے پردہ اٹھانے اور حقائق سامنے لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔گرچہ کچھ غیر معیاری مواد بھی اس پر نشر ہو رہا ہے۔مگر وہ تو ہمارے استعمال پر منحصر ہے،اس میں میڈیا کا کوئی قصور نہیں ہے۔مختصراً یہ کہ ادب کے فروغ میں اس کا کردار مثبت اور اہم ہے۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: میری پہلی کتاب ''شاہکار پشتو افسانے'' کے نام سے کلاسیک لاہور نے شائع کی تھی۔خدا غریق رحمت کرے آغا امیر حسین کو جنہوں نے پہلے یہ تراجم اپنے ادبی میگزین ''سپوتنک'' میں شائع کئے اور پھر ان پشتو افسانوں کے اردو ترجمے کو کتابی شکل میں شائع کیا۔اس کے بعد میں نے ''نہج البلاغہ'' کے پشتو ترجمے،جس کا کام امیر حمزہ خان شنواری کر چکے تھے،اسے ایڈٹ اور مکمل کر کے شائع کروایا۔ڈاکٹر علی شریعتی کی ایک طویل فارسی نظم کو میں نے اردو میں ترجمہ کیا جو کہ بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوگئی۔اردو مقالات کی کتاب ''رگ تاگ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔فارسی مقالات پر مشتمل کتاب بھی میری چھپ چکی ہے۔جس کا نام ''سخن عشق'' ہے۔خواتین شادی بیاہ کے موقع پر جو پشتو میں لوک گیت گاتی ہیں ان کو میں نے ''ٹنگئی'' کے نام سے جمع کر کے شائع کیا۔اس کے علاوہ لوک ورثہ کا میں نے انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جو چھپ چکا ہے۔لوک کہانیاں اور پھر لوک ورثہ اسلام آباد سے ایک اور کتاب بھی شائع ہوئی خوش حال خان خٹک کی فارسی شاعری کو میں نے اکٹھا کیا جو ''در کوچہ ماہ'' کے نام سے شائع ہوئی،اسکا دیباچہ وغیرہ بھی میں نے ہی لکھا تھا۔حال ہی میں ڈاکٹر شفیعی کدکنی کی اہم کتاب ''ادوار شعر فارسی'' کا میں نے اردو ترجمہ کیا۔جو کہ چھپ چکا ہے اس کے علاوہ تراجم اور تحقیق کی تین کتابیں تیار ہیں۔شاعری میں تین زبانوں میں کرتا ہوں۔ادبی سفر کی ابتداء بھی شاعری سے ہی ہوئی مگر ابھی تک شعری مجموعہ کوئی شائع نہیں ہوسکا۔اس کی وجہ حالات اور میری جبری ہجرتیں ہیں۔

ارژنگ: آغا آپ نے زیب مگسی کا دیوان بھی تو مرتب کیا تھا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: جی ہاں!یاد آیا،زیب مگسی ہمارے بلوچستان کے بڑے زبردست شاعر ہیں۔ان کے کلام پر میں نے زاہدان یونیورسٹی کی ڈاکٹر مریم خلیلی کے ساتھ مل کر کام کیا ہے اور دیوان مرتب کیا ہے۔اس کے علاوہ بلوچستان کی لوک کہانیوں کا بھی میں نے انتخاب کیا ہے جسے لوک ورثہ اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ڈاکٹر علی شریعتی کی نظموں کا ترجمہ بالکل تیار ہے''دفتر ہائے سبز'' کے نام سے ان کی نظمیں ہیں۔اس کے علاوہ جدید فارسی شعراء کا انتخاب اردو ترجمے کے ساتھ بالکل تیار ہے چھپنے کے لئے۔لوک ورثہ اسلام آباد سے ایک کتاب اشاعت کے مراحل میں ہے۔بلوچستان کی لوک شاعری کی ایک صنف ہے'' کاکڑی غاڑی''اسی نام سے اس صنف کی لوک شاعری کا انتخاب جو میں نے کیا ہے شائع ہو رہا ہے۔

ارژنگ: جبری ہجرت سے آپ کی کیا بات ہے؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: ٹارگٹ کلنگ سے بچنے کے لئے 2012 میں مجھے کوئٹہ چھوڑنا پڑا۔مسلک کی بنیاد پر جب خون ریزی حد سے بڑھ گئی تو مجھے بادلِ نخواستہ جبری ہجرت کرنا پڑی اور میں اسلام آباد آگیا۔اسلام آباد میں چند سال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے منسلک رہا۔اس کے بعد وفاقی یونیورسٹی میں کچھ عرصہ پڑھایا۔اس سال کا آغاز تھا کہ میں اسلام آباد چھوڑ کر واپس کوئٹہ آگیا ہوں۔

ارژنگ: آپ نے پی ایچ ڈی تہران یونیورسٹی سے اقبال اور خوشحال خان خٹک کے موضوع پر کی ہے۔ایران جا کر پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: دراصل بی اے کرنے کے بعد میں ماسٹرز کے لئے بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ آگیا۔یہاں ایک شفیق استاد کے مشورے پر میں پشتو میں ایم اے کرنے لگا۔پشتو شعبہ کی کلاسز کا حال مگر پتلا تھا۔ویرانی ہی کا منظر عمومی تھا،کلاسز کم کم ہی ہوتی تھیں۔میں اجازت لے کر اردو کے شعبہ میں لیکچر سنتا رہتا،اسی دوران خانہ فرہنگ ایران نے فارسی سکھانے کا اہتمام کیا تو میں نے بھی داخلہ لے لیا۔اور ایک سال کم وبیش کا عرصہ مسلسل پڑھتا رہا۔ایم اے گولڈ میڈل لے کر کر چکا تو میری سرکاری نوکری بطور پشتو لیکچرار ہوگئی۔اس دوران خانہ فرہنگ سے جو میں فارسی سیکھ رہا تھا۔تو اس میں بھی نمایاں پوزیشن آئی۔ایران جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے تہران یونیورسٹی دیکھی اور معلوم ہوا کہ لوگ یہاں کیسے پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔بس میں نے فیصلہ کیا پی ایچ ڈی کرنی ہے۔بغیر تنخواہ کے چھٹی لے کر ایران میں داخلہ لینے کے بعد تہران یونیورسٹی میں ایک بار پھر طالب علمی اختیار کر لی۔

ارژنگ: پسندیدہ شاعر اور نثر نگار کون ہے؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: اردو میں دیکھا جائے تو غالب بڑا شاعر ہے میں میر تقی میر اور غالب دونوں کا مرید اور معتقد ہوں۔اقبال کی عظمت سے بھی انکار ممکن نہیں۔عہد حاضر میں مجھے افتخار عارف بہت پسند ہیں۔ناول میں عبداللہ حسین اور افسانے میں انتظار حسین پسند ہیں۔راجندر سنگھ بیدی نے مجھے بہت متاثر کیا۔رشید امجد اور منشا یاد بھی بہت اچھے لکھاری

تھے۔سبھی کی مجموعی چاشنی ہے۔

ارژنگ: اسلام آباد کیوں چھوڑ دیا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: اسلام آباد کے لوگوں میں تصنع اور بہت بناوٹ ہے، بڑے کھوکھلے اور جعلی لوگ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ بڑا شہر ہے، میری بھی گنجائش نکل آئے گی۔ کچھ اچھے دوستوں سے تو پہلے ہی رابطہ تھا۔ جو یہاں مقیم تھے، مگر اسلام آباد آ کر محسوس ہوا کہ بہت ہی مطلب پرست لوگ ہیں یہاں کے رہنے والے۔ تعلیمی اور سرکاری اداروں میں اگلے گریڈ کے لئے یہاں لوگ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اہل آدمی کی یہاں بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی اہل آدمی کسی بھی ادارے میں یہاں آجائے تو سبھی لوگ اس کے خلاف سازشیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ آپ چاہے لکھ دیں مجھے اسلام آباد کے لوگوں کے کردار دیکھ کر سخت مایوسی اور کوفت ہوئی۔

ارژنگ: کیا کھویا؟ کیا پایا؟

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش: مختصر ترین سوال ہے، مگر مشکل ترین سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کھونے کو تو جو ہمارا معاشرہ ہے، میں نے انسانی اور مذہبی حوالے سے بہت کچھ کھو دیا ہے، مگر سب سے زیادہ ملال مجھے وقت کے کھو جانے کا ہے۔ میں نے وقت کو کھویا ہے۔ حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ حالات کا جبر تھا۔ مگر ان حالات کی وجہ سے میرا بہت سارا وقت ضائع ہوا ہے۔ بالکل فضول کاموں اور جبری ہجرت کی پریشانیوں میں۔ اس وقت کے کھونے کا مجھے افسوس ہے۔ سب سے قیمتی چیز جو میں نے پائی ہے وہ محبت ہے۔۔ دوستوں کی بے پناہ محبتیں میرے نزدیک سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کے علاوہ میں کہوں گا کہ فارسی ادب کا سرمایہ جو میں نے پایا ہے۔ ادب کا سرمایہ مجھے ثروت مند ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ دوستوں کی بے لوث محبتیں اور ادب کی رم جھم وہ قیمتیں اشیاء ہیں جو میں نے اس زندگی میں پائی ہیں۔

غزل/حسن عباسی، لاہور

دیکھا ہے تم کو میں نے تو دیکھی ہے شاعری
یوں لگ رہا ہے سامنے بیٹھی ہے شاعری

ترکیب و استعارہ کی مجھ کو خبر نہیں
میں نے ترے جمال سے سیکھی ہے شاعری

اتنے حسین ہاتھ، کسی اور کے نہیں
جیسے یہ ہاتھ تھام کے اُتری ہے شاعری

ویسے تو شاعری کو کوئی پوچھتا نہیں
لیکن تری پسند کی مہنگی ہے شاعری

حیرت کا در ہمیشہ ہی مجھ پر کھلا رہا
صد شکر میرے حصے میں آئی ہے شاعری

لب پر ترے نثار ہے افسانوی ادب
قربان تیری آنکھ پہ جچتی ہے شاعری

ہم شاعروں کو اتنی سہولت ہے عشق میں
ہوتا نہیں ہے کچھ بھی تو ہوتی ہے شاعری

حاصل ہے شاعری کا یہی بات بھی حسؔن
میں نے سنا ہے مری پڑھتی ہے شاعری

غزل/لبنیٰ صفدر، لاہور

بات یہ روبرو ہے صاحب سے
شاعری گفتگو ہے صاحب سیل

میں تو پوری اسی سبب سے ہوئی
عشق کی آرزو ہے صاحب سے

ہاں محبت نمود ہے میری
مجھ میں ساری نمو ہے صاحب سے

اور جانب یہ اب نہیں اُٹھتی
آنکھ کی آبرو ہے صاحب سے

اک روانی سی ہے محبت میں
آنکھ میں آب جو ہے صاحب سے

ورنہ کب کی بکھر گئی ہوتی
چاک دامن رفو ہے صاحب سے

بہ یاد: سید قاسم محمود

Monthly Book Digest لاہور

بک ڈائجسٹ

ISSN 2079-4584

bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com

مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

فروغ ادب کے لیے وقف

براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری و نثر) کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زر تعاون مبلغ/-1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

برائے خط کتابت/ ترسیل زر / رابطہ

بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794-042-37322996

انٹرویو: حماد نیازی

ارژنگ: اپنی تعلیم اور ادبی و معاشی مصروفیات کے بارے بتائیے

حماد نیازی: ابتدائی تعلیم انٹر تک آبائی شہر تلہ گنگ سے ہی حاصل کی. پھر لاہور آ گیا یہاں تعلیمی زندگی کے دوران ہم نصابی سرگرمیوں میں سرگرم رہا جامعہ. پنجاب سے رول آف آنرز کا ایوارڈ ملا، آجکل گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں بطور لیکچرار اردو فرائض انجام دے رہا، پاک و ہند کے بیشتر موقر ادبی رسالہ جات اور اخبارات میں کلام شائع ہوتا رہا ہے، پہلا شعری مجموعہ "دعاؤں بھرے دالان" طباعت کے مراحل میں ہے انشاء اللہ اسی سال متوقع اشاعت، ایک نقاد کے طور پر اکیسویں صدی کی اردو غزل پر طویل مقالہ، ہندوستانی غزل کے خدوخال، اردو نظم مابعد جدیدیت کے تناظر میں تنقیدی کام زیر تکمیل ہے، اپنے معاصر مصنفین پر مضامین لکھ رہا ہوں ، 2011 اور 2012 دو دفعہ جوائنٹ سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق لاہور کے طور پر اور اس سال بطور سیکرٹری حلقہ اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں . ادبی تنظیم کولاج کی بنیاد گزاروں میں شامل ہوں،

ارژنگ: اپنے بچپن اور ابتدائی زمانہ کے بارے میں بتائیں

حماد نیازی: مجھے آج بھی اپنے بچپن اور پھر لڑکپن سے نوجوانی کی سرحد تک آتے آتے ان شاموں کی خوشبو اپنے سینے میں سرسراتی اور دل کی محل سرا میں جلتے یادِ رفتگاں کے چراغوں کی لو کو بھڑکاتی محسوس ہوتی ہے جن شاموں میں میرا باپ مجھے حافظ شیرازی، مولانا روم اور غالب کے شعر سنایا کرتا تھا اور بعض اوقات اس کے سرخ اناروں جیسے ہونٹوں سے مس ہوتے ہوئے اس کی بہشت ا؟ ثار ا؟ نکھوں سے دھلے ہوئے مقدس ا؟ نسو اس کی شبد ا؟ لود داڑھی میں ا؟ گرتے تھے اور پھر گھر میں جیسے سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایک پراسرار جادوئی سناٹا۔۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنے بہن بھائیوں کے لیے کسی کی ا؟ نکھوں کو اتنا موسلا دھار ہوتے نہیں دیکھا جتنی ابو کی ا؟ نکھیں اپنے بہن بھائیوں کے لیے برسیں۔۔ کسی نے گریے کی تہذیب سیکھنی ہو تو میرے باپ کی ا؟ نکھوں سے بہتر درسگاہ اس موجود دنیا میں کہیں نہ مل سکے یہ میرا دعوٰی ہے۔ مجھے وہ راتیں نہیں بھولتیں جب اپنی بیٹیوں کے لیے ساری ساری رات ہماری بیٹھک میں نماز کے لیے مخصوص جگہ پر وہ ایسے تڑپتے جیسے کوئی مچھلی بنا پانی کے تڑپتی ہے۔ میں اکثر کبھی صبح کی نماز کے لیے اس جگہ پر ا؟ تا تو وہ جائے نماز ایسے ا؟ نسوو؟ ں سے بھیگی ہوتی جیسے کسی نے اسے موسلا دھار بارش میں رکھے رکھا ہو۔ ہم پانچوں بہن بھائیوں کو انہوں نے لفظوں، دعاو؟ ں، شدید محبت سے مزین گریے کی تہذیب میں پروان چڑھایا

ارژنگ: آپ کے نزدیک شاعری کیا ہے یا آپ کا نظریہ شعر کن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے؟ آپ اپنی شاعری اور تخلیقی عمل کے محرکات کو کیسے بیان کرتے ہیں۔

حماد نیازی: میرے باپ نے ساری زندگی معبدوں، خانقاہوں، درس گاہوں میں لفظوں کی مزدوری کی، اور میں نے بھی انہی کے درمیان رہتے ہوئے اپنے ہونے نہ ہونے کے مفہوم کو سمجھا ہے۔ اب وہ نہیں رہے تو ان کی یاد اک شبد کی طرح مجھ پر کھلتی ہے، پراسرار اساطیری شبد جو ہر رات نادیدہ قدیم مسکن سے سفر کرتا ہوا میرے من کے بستر پر ا؟ لیٹتا ہے سانس کی لو تیز کرتا ہے اور سینے کے بال جیسے تن ا؟ ور درخت کی طرح کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ شبدوں کی ا؟ واز بھی ہوتی ہے ایسے جیسے کسی پیاسے دشت میں ہلکی ہلکی بوندوں کی ا؟ واز.... میں نے اس ا؟ واز کو اپنے کانوں میں کسی ریشمی پھول کی طرح سرسراتا محسوس کیا ہے اس ا؟ واز کے درمیاں رہتے ہوئے میں نے بھیدوں پر شہنشاہی کی ہے اس سے ہر دن ملاقات کی ہے.

ارژنگ: شاعری ایسے آپ پر نہیں کھلتی ہے

حماد نیازی: اپنے بدن کی پور پور پہ لفظوں کو جینا پڑتا ہے. لفظوں کی سسکاریوں کو سینے میں سنسناتے ہوئے محسوس کرنا پڑتا ہے راتوں کو دن میں اور دنوں کو رات میں گزرتے ہوئے دیکھنا پڑتا ہے

اداسی کی گرد میں گیت گاتے ہوئے زندگی کی لے دریافت کرنی پڑتی ہے

میں نے بارگاہوں کی محرابوں سے لے کر شاہراہوں اور بازاروں کی دھول میں نظموں کی تصویریں بنائیں، دیواروں میں رینگتی خاموشی سے پہروں مکالمہ کیا ہے. ادب لفظوں سے عصمت دری کا نام نہیں نہ ہی یہ اپنی آواز کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے کا نام ہے.

میرے نزدیک شاعری شبدوں کے اتہاس میں امکان بھرنے کا نام ہے. وقت کے سینے میں دھڑکنے کا نام ہے. سناٹے کو آواز میں بدلنے کا نام ہے

ارژنگ: درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہونا

خواب تھا یا حادثہ تھا

حماد نیازی: ادب کی لو سینے میں بچپن سے ہی بھڑکا دی گئی تھی سو میں نے اپنی زندگی اپنے خوابوں کے ساتھ جی ہے سائنس میں جیالوجی جیسی فیلڈ میں ایم ایس کرنے کے بعد بھی میں نے اپنے passion کی راہ چنی اور اپنے لفظوں سے عشق کو رزق میں بدلتے ہوئے مجھے کبھی پچھتاوا نہیں ہوا.. لفظوں میں رہنا اور ان کو آگے پہنچانا کوئی حادثہ نہیں تھا میں نے اپنے لیے اس راستہ کو چنا اور قسام ازل نے اسی میں میرا رزق لکھ دیا مجھ ایسا شخص بھلا کیوں نہ شکر گزار ہو

ارژنگ: موجودہ مشاعروں کے حق میں ہیں یا خلاف؟

حماد نیازی: مشاعرے کی تہذیبی روایت کنسرٹس میں تبدیل ہو رہی ہے اور ہم سب اس کی بربادی کے برابر مجرم ہیں... عزت اور شہرت کی تمنا رکھنا ایک فطری عمل ہے. عزت و شہرت بھی ایک قسم کا رزق ہیں مگر اس کے حصول کے لیے، ہمیں اپنی نسلوں کی تہذیبی بربادی کا حصہ نہیں بننا چاہیے. اپنی نوجوان نسلوں کو ہم کس چیز کی طرف لے کے جا رہے ہیں. دلیل یہ دی جاتی ہے کہ لوگ پسند ہی یہی کرتے ہیں تو ہم نے ان کے مزاج کے مطابق چلنا ہے. تو ان کے ادبی و معاشرتی ذوق کی تربیت پھر کس نے کرنی ہے. اگر ایسی برینڈ زدہ عوام ہی نے ادبا کے تہذیبی معیارات متعین کرانے ہیں تو میرے خیال میں ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم اپنے ادب کی نماز جنازہ کے لیے صف بندی کر چکے ہیں.. جس کی امامت کے لیے ہر کوئی تیار نظر آتا ہے.

ارژنگ: معاصر تنقید، اور ہمارے ادبی اداروں کیکردار کے بارے آپ کی کیا رائے ہے

حماد نیازی: ہماری شاعری پر تنقید کو دیکھا جائے تو آج کی نسل کا تخلیقی مقدمہ لڑنے کو کوئی اسٹیبلشٹ نقاد تیار نظر نہیں آتا۔ معدودے چند ادیبوں کے علاوہ عمومی منظرنامے کہ دیکھیں تو مخصوص لابیاں ہیں جن میں صرف انہی لوگوں پر بات کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے جو ان کی دادا گیری اور سلطنت عیاراں میں توسیع کا باعث بن سکتے ہیں۔ ادب کو ہمارے نام نہاد ادبی حلقوں، آرٹس کونسلوں اور ادبی اکیڈمیوں میں صرف محدود دا شرافیہ کے نوازے ہوئے باسی مضامین کی جگالی کرتے چار چار پانچ پانچ دہائیوں سے غاصبانہ قابض صرف انہی لوگوں کی لونڈی بنا دیا گیا ہے جن کے پاس بیس بیس سالوں میں ایک دو غزلوں یا نظموں کے سوا عیارانہ زنبیل میں اور کچھ نہیں نظر آتا۔ ہر کانفرنس ہر تقریب ہر مشاعرے میں صرف انہی چہروں کی تقریب رونمائی سو سو بار کرا کرا کر ان کے اصل چہروں کو اتنا مسخ کر دیا گیا ہے کہ اب ان کو دیکھ کر لفظوں کو بھی گھن آتی ہے۔ نا یک دو ادبی رسالوں کے سوا ہمارے نمائندہ ادبی رسالے جن کو ان جغادری ادیبوں اور بین الاقوامی ادبی تقریبوں کے ارگنائزرز کی آشیرباد حاصل ہے ان میں کوئی چیز چھاپنے سے پہلے، بھلے وہ کس تخلیقی کرب اور محنت سے لکھی گئی ہو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس چیز کے لکھنے والے کو سلطنت عیاراں کے کس بڑے پادری کی سند حاصل ہے اور یہ لکھنے والا کس لابی سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے بعض دفعہ مسلک بعض دفعہ نظریاتی وابستگی اور بعض جگہ مولویانہ پن (دونوں انتہاؤں کا) اور کبھی ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے

اب جو منظر ہے یہ منظر ہو نہ ہو، چلتے بنو\
کیمرے سے خواب کی تصویر لو، چلتے بنو\
باؤ جی دنیا سرائے ہے کوئی رکتا نہیں\
چائے پانی پی چکے ہو؟ تو چلو، چلتے بنو\
اس جزیرے پر محبت ڈھونڈنا جائز نہیں\
خیر چھوڑو آ گئے ہو ڈھونڈ لو، چلتے بنو\
نقش کوئی دیر ہے آواز کی تصویر کا\
وقت جو بھی ہے، سنو، اپنی کہو، چلتے بنو\
وہ یہیں تھا، ہاں یہیں، پہلو نشیں، بالکل قریں\
اب نہیں ہے سو نہیں ہے مان لو، چلتے بنو\
شور کی خیرات بانٹی جا رہی ہے شہر میں\
اپنا اپنا شور سینے میں بھرو، چلتے بنو

....

دل کی گلیوں میں گونجتی آواز\
دھیمی دھیمی ڈری ڈری آواز\
میں نے رخت سفر میں رکھی ہیں\
لفظ ،خوشبو .دعا .تری آواز\
رات کی گود میں گرے آنسو\
صبح کی تھال میں کھلی آواز\
آب _ تقدیس سے دھلی آنکھیں\
لحن _ معبود میں گندھی آواز\
آئینے باغ، خواب حیرانی\
بانسری دشت،شاعری آواز\
لمس کی دوپہر میں گھل جائے\
ہجر کی دھوپ تاپتی آواز\
کتنی آنکھوں میں بجھ گئیں شمعیں\
کتنے سینوں میں مر گئی آواز\
اولیں سر میں کیوں نہیں ہوتے\
آخری گیت ،آخری آواز\
کوئی آیا تھا کیا؟ بتایئے نا !\
کوئی آواز تھی ،،،وہی آواز

ادبی خبریں

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

☆ خادم نعت راجا رشید محمود گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔

☆ پرائڈ آف پرفارمنس سنگر شوکت علی لاہور میں انتقال کر گئے۔

☆ جید مسلسل کی علامت آئی اے رحمان خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

☆ ممتاز شاعر میجر (ر) شہزاد نیر کے والد خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆ خبریں گروپ کے ضیاء شاہد گزشتہ دنوں لاہور میں وفات پا گئے۔

☆ معروف افسانہ نگار، ناول نگار مشرف عالم ذوقی بھارت میں انتقال کر گئے اور ان کی اہلیہ معروف ادیبہ تبسم فاطمہ بھی جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی ہیں۔

☆ ممتاز ادیب جنید اکرم گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔

☆ گزشتہ دنوں معروفت شاعرہ کرن وقار، والدہ کرن وقار اور بھائی کرن وقار کی ناگہانی موت نے سب کو رُلا دیا۔

☆ معروف ادیب پروفیسر اکرم طاہر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

☆ معروف شاعر افضل خان کی والدہ گزشتہ ماہ بہاولپور میں انتقال کر گئیں۔

☆ پنجابی کے معروف شاعر بشیر باوا جی وفات پا گئے۔

☆ ممتاز ادیب ڈاکٹر نواز کاوش کے بھتیجے گزشتہ دنوں رحیم یار خاں میں انتقال کر گئے۔

☆ ماہر آثار قدیمہ محقق شاعر اور ادیب زبیر شفیع غوری انتقال کر گئے۔

☆ معروف شاعر اور ادیب یونس شہباز امریکہ میں انتقال کر گئے۔

☆ اسد نقوی کے والد سید ظفر نقوی اللہ کے پاس چلے گئے۔

☆ معروف ادیبہ عنبرین صلاح الدین کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال کر گئیں۔

☆ معروف ادیب مشیم نقوی کی والدہ بضائے الٰہی وفات پا گئیں۔

☆ معروف ادیب مستقیم نوشاہی کی والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

☆ نقاد اور محقق پروفیسر ڈاکٹر گوہر نوشاہی اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

گزشتہ کچھ عرصہ میں جتنے شاعر، ادیب اور صحافی دارِ فانی سے کوچ کر گئے ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کی مغفرت کے لئے دعا گو ہے اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

....

☆ 21 فروری کو مادری زبانوں کے عالمی دن پر پنجابی زبان کو پرائمری سے نصابی کتب کا حصہ بنانے کے لئے لاہور پریس کلب سے چیئرنگ کراس تک ریلی نکالی گئی۔ الحمراء ادبی بیٹھک میں اردو سیمینار ہوا اور نفاذِ اردو کے لئے زور دیا گیا۔

☆ ادارۂ خیال وفن نے درجن بھر کتب کے خالق سکندر سہرات کی شام منائی۔ صدارت: کرامت بخاری، مقررین: ممتاز راشد لاہور، اسد اللہ ارشد، راؤ کلیم خاں، عندلیب شہزادی، پروین وفا ہاشمی، سلینہ خاں، احمد فہیم میو، عدل منہاس لاہوری اور دیگر۔

☆ بزم پُرنم نے پُرنم الہ آبادی کی برسری پر لاہور پریس کلب میں مشاعرہ اور قوالی کی محفل برپا کی۔ ان کی مشہور قوالی تھی ''بھر دو جھولی میری......'' اقبال بیام نے بھرپور میزبانی کی۔

☆ بزم عامل کا ماہانہ مشاعرہ الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں ہوا۔ صدارت پروفیسر گلزار بخاری نے کی۔

☆ ''سخن فورم'' کا مشاعرہ پلاک لاہور میں ہوا۔ صدارت: خالد شریف، مہمانِ خصوصی: افضال فردوسی، توقیر شریفی، فرتاش سید، نصرت عارفین، ممتاز راشد لاہوری، اکرام عارفی، کنور امتیاز احمد، وقاص عزیز، نین علوی، زاہد محمود، زاہدہ جبیں، اتباف ابرک اور دیگر تھے۔

☆ ادارۂ خیال وفن کے تحت عدل منہاس لاہوری کی کتاب اول آنے پر اُن کے اعزاز میں تقریب اور مشاعرہ۔ صدارت: عاشق رحیل۔ مہمانِ خصوصی: بشیر ناطف، نجمہ شاہین، محمد جمیل، نظامت: عقیل شافی، استقبالیہ کلمات: ممتاز راشد لاہوری، دیگر شعراء: ہمایوں پرویز مرزا، شہباز ساغر، ایم آر مرزا، ڈاکٹر ایم ابرار، فراست بخاری، غلام محمد ساقی اور محمد نوید قلندری۔

☆ پنجابی ادب سنگت کا مشاعرہ پروفیسر عاشق رحیل کی صدارت میں ہوا۔

☆ بزم انجم رومانی کے تحت اداکار حبیب کی برسی اور ان کے داماد نواب سعید خان ایڈووکیٹ کے چہلم پر الحمراء ادبی بیٹھک میں تقریب ہوئی۔ نظامت صدر بزم ڈاکٹر ایم ابرار نے کی۔

☆ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کے تحت ماضی سانما ایڈیٹوریم شادمان لاہور میں سیمینار ہوا۔ موضوع تھا ''انڈس ویلی میں تہذیبی ورثہ'' تقریب کی نگرانی مقصود خالق اور نظامت شہزاد میاں نے کی۔ کئی مقررین نے خطاب کیا۔

☆ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن لاہور نے تنویر احمد خاں اور جاوید آفتاب کی نگرانی میں ساحر لدھیانوی کانفرنس منعقد کی۔

☆ گلشن ادب کا ماہنامہ مشاعرہ عقیل شانی کے ہاں امین پارک بند روڈ لاہور میں ہوا۔ صدارت: اقبال راہی، مہمانان خصوصی: ممتاز راشد لاہوری، چاک شاہ، علی حسین عابدی...... کوئی بیس شعراء نے کلام سنایا۔

☆ حلقہ ارباب فنون لطیفہ کی ماہانہ محفل حسب معمول ڈیفنس لاہور میں ایرج مبارک کے ہاں ہوئی۔ یہ زاہد ڈار کے لئے تعزیتی ریفرنس تھا۔ شرکاء: اکرام اللہ، ڈاکٹر امجد طفیل، پروفیسر شفیق احمد خاں، ممتاز راشد لاہوری، ڈاکٹر غافر شہزاد، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، محمد جمیل، محمد احمد، ریاض احمد اور دیگر۔

☆ بزم عروج ادب لاہور کا تاسیسی مشاعرہ الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں ہوا۔ یہ نعتیہ مشاعرہ تھا۔ صدارت نسیم فضل نسیم۔ مہمانان خصوصی: جبار مرزا، میاں نذیر اختر، سمیرا بتول، امجد رسول امجد......، نظامت، ممتاز راشد لاہوری، استقبالیہ کلمات: عروج زیب اور شکیل احمد زیب، تقریباً 45 شعراء و شاعرات نے نعتیہ کلام سنایا۔

☆ بزم اخگر لاہور کا ماہانہ مشاعرہ راؤ کلیم خاں ایڈووکیٹ کے ہاں جہانگیر پارس فیروز پور روڈ لاہور (نزد جنرل ہسپتال) میں ہوا۔ صدارت عدل منہاس لاہوری، نظامت: یوسف یار، کئی شعراء نے کلام سنایا۔

☆ اکادمی ادبیات لاہور میں زاہد ڈار کے لئے تعزیتی ریفرنس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید نے کی۔ کئی احباب نے اظہار خیال کیا۔ اس ادارہ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر اور معروف ناول نگار محمد عاصم بٹ کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا ہے۔

☆ فلمی وصحافی شخصیت طفیل اختر دادا کا ایک تعزیتی ریفرنس بزم انجم رومانی نے اور ایک مرحوم کے قریبی دوست آفتاب خان نے الحمراء ادبی بیٹھک میں منعقد کیا۔ فلمی صحافت کی کئی شخصیات نے اظہار خیال کیا۔

☆ بزم ذرساجد اور بزم انجم رومانی نے الحمراء ادبی بیٹھک میں نجمہ شاہین کے شعری مجموعہ ''آرزوؤں کے دریچے'' کی رونمائی زیر صدارت کرامت بخاری منعقد ہوئی۔ نظامت: ڈاکٹر ایم ابرار۔ استقبالیہ کلمات: اسلم جاوید ہاشمی۔ مقررین: ڈاکٹر کنول فیروز، ممتاز راشد لاہوری، فراست بخاری، فریدہ خانم، فاطمہ غزل، تسنیم تصدیق اور دیگر کئی۔

☆ بزم چغتائی لاہور کا ماہنامہ مشاعرہ زیر صدارت ممتاز راشد لاہوری منعقد ہوا۔ مہمانان خصوصی: قاسم جاوید، راؤ احسان ندیم، نظامت: عاصم خواجہ، میزبان: طارق چغتائی، دیگر شعرا تھے۔ پروفیسر محمد عباس مرزا، ڈاکٹر طارق عزیز، کامران ناشط، فرخ محمود، وسیم عباس بخش نسیم، افضل ساجد اور دیگر

☆ حافظ سلمان بٹ کے لئے جماعت اسلامی کا تعزیتی ریفرنس الحمراء آرٹس کونسل کے ہال نمبر 1 میں ہوا۔ انہیں شانِ لاہور قرار دیا گیا۔

☆ بزم بشیر رحمانی کے تحت الحمراء ادبی بیٹھک میں مقابلہ کتب پر ایوارڈ، اسناد اور انعامات کی تقریب زیر صدارت ڈاکٹر سعید، منعقد ہوئی۔ میزبان محمد نوید مرزا تھے۔ نمایاں مہمانوں میں ڈاکٹر کنول فیروز، راشد محمود، ممتاز راشد لاہوری، عارف نوناروی، وقاص عزیز، اشرف سلیم، نذیر انبالوی، محمد شعیب مرزا، حاجی ڈاکٹر کنول فیروز، لطیف کھوکھر، اعجاز فکرال، اقصیٰ صابر برہ، نجمہ شاہین، اعجاز فیروز اعجاز، ڈاکٹر تنویر سرور اور دیگر کئی شامل تھے۔

☆ باڑہ ادبی لیکوتکی لنڈی ارباب پشاور کا پندرہ روزہ تنقیدی اجلاس گزشتہ روز باڑہ ادبی لیکوتکی لائبریری پشاور میں منعقد ہوا۔ صدارت صاحبزادہ نور الٰہی تیمور نے کی۔ ایاز آفریدی کی غزل تنقید کے لئے پیش کی گئی۔

☆ زاویہ علم وادب کے زیر اہتمام خیبر پختونخواہ کے نامور ادیب ابراہیم شبنم کی یاد میں تعزیتی اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں بہت سے شاعروں ادیبوں نے شرکت کی۔ اجلاس میں مرحوم کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا گیا اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔

☆ منڈان ادبی گلدستہ بنوں کا تعزیتی اجلاس معروف ادیب اورنگزیب بے تاب کی یاد میں منعقد ہوا ان کی ناگہانی موت پر خصوصی دعا کی گئی اور علمی و ادبی حوالے سے ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

نامہ ہائے احباب

برادرم حسن عباسی صاحب
السلام علیکم!

امید ہے آپ معہ اہل خانہ خیریت سے ہونگے۔ ملک میں کرونا کی شکل میں بلکہ ملک ہی کیا تمام دنیا میں جو وبا پھیلی ہوئی ہے خداوند کریم اپنے نبیؐ کے صدقہ اس سے بچائے اور یہ وباء ٹال دے، آمین!

اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھیئے اور بچاؤ کے تمام اصولوں اور طریقوں پر عمل کیجئے۔ خدا ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

کل ہی جناب اظہر عنایتی صاحب نے بذریعہ وٹس اپ غزل ارسال کی تھی جو آپ کو ارسال کر رہا ہوں اور آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنی بھی غزل پیش خدمت ہے۔

میں نے اظہر صاحب سے آپ کا ذکر کیا تو بہت خوش ہوئے آپ کو سلام بھیجا ہے۔

فقط: والسلام
نصرت صدیقی، فیصل آباد

قابلِ احترام عباسی صاحب!

اسلام علیکم! پہلے ارژنگ میں ڈاک سے بھجوائی ہوئی تحریریں تواتر سے لگا کرتی تھیں۔ بعد میں میل والی چیزیں بھی لگ جاتی تھیں لیکن ای میل والی چیزیں بھی جب لگنا بند ہوگئیں تو ہم نے اس وجہ سے بھجوانا چھوڑ دیا۔ آپ کو فون بھی کرتے رہے مگر کال اٹینڈ نہیں ہوتی تھی۔ آج ہمت کر کے دو کتب اور حمدیں ارسال خدمت ہیں۔ آپ سے بہت دیرینہ نیازمندی ہے۔ آپ کے احسانات کا بھی مشکور ہوں۔ امید واثق ہے کہ کرم نوازی فرمائیں گے۔

مخلص ودعاگو
ریاض ندیم نیازی، سبی

محترم حسن عباسی مدیر ماہنامہ ارژنگ
اسلام علیکم!

ماہنامہ ارژنگ شمارہ نمبر 5 اور شمارہ نمبر 11 موصول ہوا ہے۔ شکر گزار ہوں الحمدللہ شمارے ملنے کے فوراً بعد سے مطالعہ شروع کر چکا ہوں۔ اور اب کے دعا گو ہوں کہ ارژنگ کی وساطت ادبیات سے یہ تعلق قائم و دوائم رہے۔ میرا پہلا کلام ماہنامہ ارژنگ میں جناب قمر حجازی مرحوم کی وساطت سے چھپا تھا۔ ماہنامہ ارژنگ علمی وادبی طور پر ایک منفرد رسالہ ہے۔ جس کو مسلسل شائع ہوتے ہوئے 22 واں سال ہے۔ یہ ناصرف فروغ ادب کا حسین ذریعہ بلکہ نئے اُبھرتے ہوئے شاروں کو ادبی آسمان میں متعارف کروانے کے لئے بہترین پلیٹ فارم ہے۔

اپنے چند لمحات کے مطالعہ کو اور اپنی افکار کو قلمبند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شمارہ نمبر 11 کی ابتداء حمدیہ و نعتیہ حصّے سے ہوئی ہے۔ کلام اپنے اندر کیف و سرور لئے ہوئے ہیں۔ ریاض مجید صاحب کا کلام "ماشاء اللہ" اور خالد علیم صاحب کا کلام "آنکھیں جھکیں جو بابِ رسالت پناہ پر" اعلیٰ تخلیقات کا مجموعہ ہیں۔ جناب سہیل احمد کا کلام دعاؤں، آرزوؤں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ ہر عاشق کو طیبہ کا سفر میسر ہو۔ جناب سہیل کے کلام سے ایک شعر۔

تو وہ ہے کہ نظروں سے مقدر کو بدل دے
بھی...... منتظرِ لطف مرے دل کا نگر سے

صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی کا ہر شعر کمال ہے۔ خوبصورت تخلیات کا امین ہے۔ ان کے کلام سے دو اشعار

خدا کا نام نہ لے وہ کبھی خدا کے لئے
کہ جس کا دل نہ دھڑکتا ہو مصطفیٰؐ کے لئے

وہ ایک سجدہ ابھی تک مری جبیں پہ ہے قرض
بچا کے رکھا ہے جو ان کے نقشِ پا کے لئے

جناب صبیح الدین کے لئے ایک صفحہ مختص دیکھ کے بہت اچھا لگا۔ ان کا نعت سے لگاؤ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ صنف سخن نعت پر بہت اعلیٰ کام کر چکے ہیں۔ یہ ان پر اللہ اور اس کے رسولؐ کا خاص کرم ہے۔ محبوب کبریاؐ کی شان میں ثنا خوانی کا اذن خدا سے عطا ہوتا ہے۔ جیسے شاعری رب کا انعام ہے اس میں بطور خاص نعت رب کے خاص انعاموں میں سے انعام ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ نعتِ مصطفیٰ لکھنا قلم کی عبادت سے ناصرف یہ بلکہ بروز حشر کاغذ، قلم، الفاظ، وقت یہ شاعر کی بخشش کا سامنا بنیں گے۔ اللہ کریم جملہ نعت لکھنے والوں کے قلم اور سخن میں برکت عطا فرمائے۔ آخر میں عاشقِ رسول نعت گو شاعر جناب خورشید بیگ میلسوی کی وفات پر جملہ لواحقین اور اہلیانِ ادب سے تعزیت کرتا ہوں اللہ رب العزیز ان کے درجات بلند فرمائے ان کی نعتیہ شاعری کے تخیلات دل موہ لینے والے ہیں ان کی لکھی گئی نعت کے دو اشعار

ذکر سرکارِ مدینہ کے علاوہ کیا ہے
کوئی بتلائے مرے غم کا مداوا کیا ہے

ان کی نعلین مبارک کا ہے صدقہ لوگو
ورنہ یہ عالمِ ہستی کا جریدہ کیا ہے

اللہ کریم ماہنامہ ارژنگ کو ترقی عطا فرمائے اور ارژنگ کی پوری ٹیم کی کاوشوں میں برکت عطا فرمائے۔
مجتبیٰ شہزاد میم، گجرات

مارچ تا اپریل 2021ء میں نستعلیق مطبوعات سے شائع ہونے والی کتب

نام کتاب	صنف	شاعر/مصنف	صفحات	قیمت
مدحِ محمود	حمدیہ شعری مجموعہ	ڈاکٹر محمد افتخار الحق ارقم	192	600
تجلّی حسنِ ازل	نعتیہ مجموعہ	محمد امین ساجد سعیدی	160	400
چانگراں	پنجابی شعری مجموعہ	بابا محمد اسحاق سہوتہ	144	400
یادیں	آپ بیتی	شفاعت احمد چوہدری	300	700
زیرداغ	شعری مجموعہ	ولی عالم شاہین	244	500
رسے لتھیاں راتاں	پنجابی شاعری	ارشاد سندھو	144	400
ستم کش صفی	شاعری	سیّد ذیشان صفی لاہوری	160	400
سندیسہ ہائے دل آویز	شاعری	خالد مسعود	275	500
یہ واقعہ بھی ہونا تھا	شگفتہ مضامین	توصیف ایزد	224	1100
کھیل	ڈرامے	عبدالوحید بسمل/ترجمہ: ڈاکٹر تحسین بی بی	128	400
درویش	شاعری	انجینئر ظفر محی الدین	320	600
رائیگاں	شاعری	فیصل مقبول رائیگاں	144	400

اپنی کتاب کی خوبصورت اور دیدہ زیب اشاعت کے لیے رابطہ کریں: 0300-4489310

نستعلیق مطبوعات: F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور 0331-4489310

ماہنامہ ارژنگ کو موصول ہونے والی کتب و ادبی رسائل

نمبر شمار	نام کتاب	شاعر/مصنف	ادارہ	قیمت
1	پلکوں کے گلاب	انور ندیم علوی	زربفت پبلی کیشنز	500
2	منتہائے فکر	مقبول ذکی مقبول	اُردو سخن لیہ	500
3	میں اور میرا ابہام	حمیر اظفر	تخلیق پبلی کیشنز لاہور	500
4	تیرے میرے لمحات	احسان فیصل کنجاہی	کامرانیاں پبلشرز گجرات	500
5	چمن زارِ حمد و نعت	ریاض ندیم نیازی	ماورا پبلشرز لاہور	1200
6	فیضانِ اولیاء	ریاض ندیم نیازی	ماورا پبلشرز لاہور	1000
7	چپ دا شہر	ممتاز حسین گلتاج کا جکڑ	مکتبہ فجر لاہور	500
8	روشن ہیں سبھی تارے	امجد شریف	وادیٔ ادب پبلی کیشنز، گوجرانوالہ	100
9	الحمراء فروری، مارچ	مدیرِ اعلیٰ شاہد علی خاں	لاہور	
10	ماہنامہ بیاض	عمران منظور	لاہور	
11	ماہنامہ تخلیق	مدیر سونان اظہر جاوید	لاہور	350

عزت و شہرت کی تمنا رکھنا ایک فطری عمل ہے

نامور شاعر، استاد اور سیکرٹری حلقہ اربابِ ذوق لاہور

حماد نیازی

سے حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

میرے نزدیک شاعری شبدوں کے اتہاس میں امکان بھرنے کا نام ہے: حماد نیازی

ارژنگ: اپنی تعلیم اور ادبی و معاشی مصروفیات کے بارے بتایئے۔

حماد نیازی: ابتدائی تعلیم انٹر تک آبائی شہر تلہ گنگ سے ہی حاصل کی. پھر لاہور آ گیا یہاں تعلیمی زندگی کے دوران ہم نصابی سرگرمیوں میں سرگرم رہا۔ جامعہ پنجاب سے رول آف آنرز کا ایوارڈ ملا، آجکل گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں بطور لیکچرار اردو فرائض انجام دے رہا، پاک و ہند کے بیشتر موقر ادبی رسالہ جات اور اخبارات میں کلام شائع ہوتا رہا ہے، پہلا شعری مجموعہ ”دعاؤں بھرے دالان“ طباعت کے مراحل میں ہے انشاء اللہ اسی سال متوقع اشاعت،

مشاعرے کی تہذیبی روایت کنسرٹس میں تبدیل ہو رہی ہے

ایک نقاد کے طور پر اکیسویں صدی کی اردو غزل پر طویل مقالہ، ہندوستانی غزل کے خدوخال، اردو نظم مابعد جدیدیت کے تناظر میں تنقیدی کام زیرِ تکمیل ہے، اپنے معاصر مصنفین پر مضامین لکھ رہا ہوں، 2011ء اور 2012ء دو دفعہ جوائنٹ سیکرٹری حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے طور پر اور اس سال بطور سیکرٹری حلقہ اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ ادبی تنظیم کولاج کی بنیاد گزاروں میں شامل ہوں۔

ارژنگ: اپنے بچپن اور ابتدائی زمانہ کے بارے میں بتائیں۔

حماد نیازی: مجھے آج بھی اپنے بچپن اور پھر لڑکپن سے نوجوانی کی سرحد تک آتے آتے ان شاموں کی خوشبو اپنے سینے میں سرسراتی اور دل کی محل سرا میں جلتے یادِ رفتگاں کے چراغوں کی لو کو بھڑکاتی محسوس ہوتی ہے جن شاموں میں میرا باپ مجھے حافظ شیرازی، مولانا روم اور غالب کے شعر سنایا کرتا تھا اور بعض اوقات اس کے سرخ اناروں جیسے ہونٹوں سے مس ہوتے ہوئے اس کی بہشت آثار آنکھوں سے ڈھلے ہوئے مقدس آنسو اس کی شبد آلود داڑھی میں آ گرتے تھے اور پھر گھر میں جیسے سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایک پراسرار جادوئی سناٹا۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات پر)

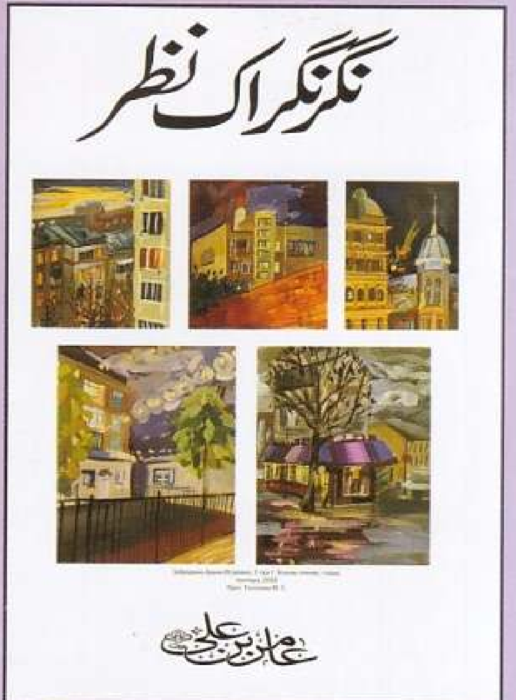

دستاویزی حیثیت اور اہمیت کے حامل سفرناموں
''جہاں گردی'' اور ''آج کا جاپان'' کی بھرپور عوامی پذیرائی کے بعد
معروف شاعر، مقبول ادیب اور منفرد کالم نگار

تازہ سفرنامہ

عامر بن علی

کے قلم سے قوسِ قزح کے رنگوں سے مزین

''نگر نگر اِک نظر''

اشاعت کے مراحل میں داخل ہو گیا ہے

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu Poetry. He has always been a globelrotter filled with the passion for travelling. Wandering all around the globe in Search of New Sights & Experiences. He has written four poetry Books & Two Travelogues along with his Books of Interviews with Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is Expoert in Seven International Languages

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو سفرنامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ ایک تجربہ نامہ ہے۔ مصنف نے جاپانی معاشرے کو اس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔ پھر ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔ اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفرناموں سے منفرد ہے۔

پروفیسر سویا مانے (شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی)

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔ شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے دنیا سے کچھ سیکھنا ہے۔ اس کتاب میں سفرنامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com